انٹرنیشنل ریسرچ کونسل برائے مذہبی امور کے زیراہتمام
آزادی فیلوشپ(۱)میں اہل علم و دانش کے خطابات و تاثرات

مکالماتِ آزادی

مدیر اعلی
محمد اسرار مدنی

تحریری ضبط
مقدس صمد خان

انٹرنیشنل ریسرچ کونسل برائے مذہبی امور
www.ircra.org

محمد اسرار مدنی مذہبی سکالر اور اسلام آباد میں قائم تھنک ٹینک "انٹر نیشنل ریسرچ کونسل برائے مذہبی امور" کے بانی و صدر ہیں۔ وہ پچھلے کئی سالوں سے ملک کے اندر عدم برداشت اور انتہا پسندی کے سدباب کے لیے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ بین المذاہب ہم آہنگی کے فروغ کے لیے وہ مکالماتی نشستوں اور تربیتی ورکشاپس کا انعقاد کرتے ہیں جن میں متنوع پس منظر کے حامل نوجوانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ انہوں نے جمہوریت اور جمہوری اقدار سے متعلق سماجی سطح پر پائی جانے والی غلط فہمیوں کے ازالے کے لیے اور مسلم دنیا میں جمہوری نظام کے تجربات سے آگاہی کے فروغ کے لیے بھی کئی نمایاں اقدامات کیے ہیں۔ وہ متعدد کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔

مقدس صمد خان نے محمد اسرار مدنی، صدر 'انٹرنیشنل ریسرچ کونسل برائے مذہبی امور' کی رہنمائی میں اس کتاب میں موجود لیکچرز کو تحریری شکل میں منتقل کیا ہے۔ یہ لیکچرز کمیونٹی پراجیکٹ کے تحت تحریری ضبط میں لائے گئے ہیں۔مقدس کا تعلق پشاور، خیبر پختونخواہ سے ہے۔ وہ آزادی فیلوشپ پروگرام ۲۰۲۳ء کا حصہ بھی تھیں۔ اس کے بعد انہوں نے کچھ عرصہ 'انٹرنیشنل ریسرچ کونسل برائے مذہبی امور' میں بہ طور پروگرام ایسوسی ایٹ خدمات انجام دی ہیں۔اب وہ چین کی یونیورسٹی آف چائنیز اکیڈمی آف سائنسز(UCAS) سے ماحولیاتی انجینئرنگ میں ماسٹرز کر رہی ہیں۔

انٹرنیشنل ریسرچ کونسل برائے مذہبی امور کے زیراہتمام
آزادی فیلوشپ(I)میں اہل علم و دانش کے خطابات و تاثرات

مکالماتِ آزادی

مدیر اعلی
محمد اسرار مدنی

تحریر ضبط
مقدس صمد خان

انٹرنیشنل ریسرچ کونسل برائے مذہبی اُمور
اسلام آباد، پاکستان

جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں

نام کتاب: مکالماتِ آزادی

مدیر اعلیٰ: محمد اسرار مدنی

تحریری ضبط: مقدس صمد خان

تزئین و سرورق: زِی گرافکس

تعاون: انٹرنیشنل ریسرچ کونسل برائے مذہبی اُمور (IRCRA)

تعداد: 1000

سال اشاعت: 2024ء

ایڈیشن: اوّل

مزید ایسے مضامین و مقالات کیلئے ہماری ویب سائٹ

www.tahqiqaat.pk

ملاحظہ فرمائیں

فہرست

- آزادی فیلوشپ پروگرام کیا ہے؟
- بین الاقوامی تعامل میں مذہب کا کردار

ڈاکٹر ماہان مرزا 9

- آسٹریلیا میں اسلام: تاریخ، مذہبی ہم آہنگی اور چیلنجز

نیل ہاکنز (Neil Hawkins) 19

- عالمی تناظر میں علاقائی استحکام، پاک افغان سرحدی مسائل

الیگزینڈرا گانٹ (Alexandra Gaunt) 25

- ثالثی کے عمل میں اقوام متحدہ کا کردار

ڈاکٹر لوری ناتھن (Dr. Laurie Nathan) .. 37

- عالم اسلام میں جمہوریت کے مختلف مظاہر اور ان کی اساسات

ڈاکٹر قبلہ ایاز 49

- بین الاقوامی تعلقات اور قوانین، پاکستان کے تناظر میں جائزہ

احمر بلال صوفی 59

- پاکستان میں جمہوریت کا مستقبل

خورشید ندیم 83

- پاکستانی جمہوریت کو درپیش چیلنجز

ظفر اللہ خان 87

- مدرسہ اصلاحات اور پاکستان کو درپیش چیلنجز اور مواقع

میجر جنرل (ر) غلام قمر 109

- خلافت یا قومی ریاست

بیرسٹر ظفر اللہ خان 130

- سیاسی اسلام کا موقف اور مذہبی روایت کا متبادل بیانیہ

شمس الدین حسن شگری 154

- کاروبار، فری لانسنگ اور ڈیجیٹل اسکلز کے مواقع

اسامہ بن منصور 216

- تنظیم 'دخترانِ پاکستان' کا تعارف

ڈاکٹر فرخندہ ضیاء 233

- آزادی فیلوشپ کے شرکاء کے تاثرات 237

تصاویر 250

- آزادی فیلوشپ (ii) کے شرکاء 254

تصاویر 261

آزادی فیلوشپ پروگرام کیا ہے؟

گزشتہ برس 'انٹرنیشنل ریسرچ کونسل برائے مذہبی امور' کے زیر اہتمام دعوہ اکیڈمی اسلام آباد میں انصاف، آزادی اور جمہوریت کے موضوع پر سات روزہ فیلوشپ پروگرام کا انعقاد کیا گیا جو 22 مئی سے 28 مئی تک جاری رہا۔ ادارے کی طرف سے بین الاقوامی معیار کے فیلوشپ کا انعقاد کیا گیا جس میں خیبر پختونخوا اور سابقہ فاٹا سے تعلق رکھنے والے مختلف مکاتب فکر کے نوجوانوں نے شرکت کی۔ یہ فیلوشپ پروگرام 'آزادی فیلوشپ' کے نام سے منسوب کیا گیا۔ ملک کی مذہبی اور سماجی ہم آہنگی کے فروغ کے ساتھ ملک میں بڑھتی ہوئی سیاسی تقسیم اور نفرت کو کم کرنا، اور آزادی، انصاف اور جمہوریت جیسے موضوعات کی تفہیم اس کے بنیادی مقاصد میں شامل تھی۔

پروگرام کا مقصد ملک میں بڑھتی ہوئی سیاسی تقسیم اور مذہبی و غیر مذہبی حلقوں میں در آنے والی خلیج کے تناظر میں مختلف متعلقہ موضوعات پر مکالماتی و تربیتی نشستوں کا انعقاد کرنا تھا۔ اس میں مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے مرد و خواتین شرکت کی جنہوں نے کھل کر بحث و مباحثہ میں حصہ لیا اور مسائل کی جہات پر اپنی آراء پیش کیں۔ نوجوانوں نے مل کر مختلف سرگرمیوں میں حصہ لیا اور ایک دوسرے کے مذاہب کے بارے میں آگاہی حاصل کی۔ مختلف موضوعات پر گفتگو کے لیے ملک بھر سے کئی اسکالرز کو مدعو کیا گیا۔ جن میں قانون دان، علماء، سفارتکار، صحافی وغیرہ شامل تھے۔

اس پروگرام میں بیرون ملک کے سفارتکاروں اور پروفیسرز نے بھی براہ راست گفتگو کی۔ معاشرے کے متحرک نوجوانوں سے مکالمہ کیا گیا۔ ایک طرف نوجوانوں نے اپنا نقطہ نظر پیش کیا تو دوسری طرف انہوں نے دیگر مذاہب اور ثقافتوں سمیت اپنے ملک کے اداروں کے بارے میں بھی آگہی حاصل کی۔ اسلام، جمہوریت، عدالتی اصلاحات، مذہبی ہم آہنگی اور آزادی سمیت اقلیتوں، خواتین اور انسانی حقوق کے مسائل سمیت بہت سارے پہلوؤں کا گہرائی سے جائزہ لیا گیا اور درست تفہیم پیدا کرنے کی کوشش کی گئی، اور معاشرے میں تعمیری کام کرنے کیلئے طریقہ کار کو واضح کیا گیا۔

انتظامیہ کی طرف سے مطالعاتی دورے کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ اس کا آغاز انسٹی ٹیوٹ آف ریجنل سٹڈیز اسلام آباد سے کیا گیا، جہاں پر پاکستان کی خارجہ پالیسی اور پڑوسی ممالک کے ساتھ تعلقات پر تبادلہ خیال ہوا اور سوال جواب کا سیشن ہوا۔ اس کے بعد فیڈرل شریعت کورٹ کا دورہ کیا گیا جہاں عدالت کے طرزِ عمل کے ساتھ ساتھ کئی شرعی فیصلوں پر نظر ڈالی گئی اور چیف جسٹس آف فیڈرل شریعت کورٹ کے ساتھ ایک نشست ہوئی۔ اس کے بعد قومی اسمبلی کا دورہ ہوا جہاں پر پارلیمانی طریقہ کار پر معلومات دی گئی۔ قومی اسمبلی کے دورے کے بعد اسلامی نظریاتی کونسل گئے، وہاں پر اسلامی نظریاتی کونسل کی ذمہ داریوں اور ملک میں اس کے کردار پر بات ہوئی، جبکہ شریعت سے متصادم فیصلوں پر نظر ثانی کے حوالے سے بھی آگاہ کیا گیا۔

خوش آئند امر یہ ہے کہ گزشتہ برس پہلے آزادی فیلوشپ پروگرام کا حصہ بننے والے شرکاء نے واپس اپنے علاقوں میں جاکر مذہبی ہم آہنگی، جمہوریت، اقلیتی حقوق اور آئین

کی بالادستی کے حوالے سے کئی اقدامات کیے اور عوام میں آگہی پیدا کرنے کے لیے سرگرم نظر آئے۔

آزادی فیلوشپ پروگرام کا سلسلہ آگے بڑھایا جارہا ہے، اور یہ طے کیا گیا ہے کہ ہر سال اس طرح کے پروگرامز کا انعقاد کیا جائے گا اور پورے ملک کے نوجوانوں کو اس سے استفادے کا موقع فراہم کیا جائے گا۔ رواں سال (2024ء) میں بھی یہ پروگرام زیادہ بڑے پیمانے پر اور مزید بہتری کے ساتھ شروع کیا جارہا ہے۔ یہ کتاب گزشتہ برس کے مہمان معلمین میں سے بعض کے لیکچرز کی تحریری شکل ہے۔ اُمید ہے کہ ادارے کے اس طرح کے اقدامات کے معاشرے میں اچھے نتائج برآمد ہوں گے اور یہ مساعی تبدیلی کے ہدف میں مؤثر ثابت ہوں گی۔

محمد اسرار مدنی

بین الاقوامی تعامل میں مذہب کا کردار

ڈاکٹر ماہان مرزا

ڈاکٹر ماہان مرزا،امریکا کی نوٹرے ڈیم یونیورسٹی میں پروفیسر، اور 'انصاری انسٹی ٹیوٹ' کے ڈائریکٹر ہیں۔ وہ دنیا میں بین المذاہب ہم آہنگی اور مختلف مذہبی طبقات کے مابین صحت مند تعلق کے فروغ کے لیے کام کرتے ہیں۔ اس لیکچر میں انہوں نے اپنے ادارے کا تعارف اور دنیا میں متنوع حلقوں کے درمیان ایک قابل قبول بیانیے کی تشکیل اور ذہن سازی کے لیے نمایاں اقدامات کا تجزیہ پیش کیا ہے۔

'انصاری انسٹیٹیوٹ' کا قیام

میں ایک ادارہ چلا رہا ہوں جس کا نام "Religion in global engagement" ہے، یعنی بین الاقوامی تعامل میں مذہب کا کردار۔ بین الاقوامی سطح پر اقوام و طبقات کے مابین جو آپسی تعلقات ہوتے ہیں اور مختلف امور پر جو ایک دوسرے کے ساتھ تبادلہ اور تعامل ہوتا ہے، اس سب میں مذہب کا کردار کیا ہے، یا مذہب کو ان امور میں کس طرح ایک امن کے آلہ کے طور پہ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ انصاری انسٹی ٹیوٹ کیسے قائم ہوا اور اس کے مقاصد کیا ہیں، میں اس پر مختصر گفتگو کرنا چاہوں گا۔ یہاں پر موجود بہت سے لوگ پہلے ہی ان چیزوں سے واقفیت رکھتے ہیں، اس لیے میں آپ لوگوں کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔

انصاری انسٹی ٹیوٹ، میں 'انصاری' نام، رفعت اور زورین انصاری سے آیا ہے، جو ڈاکٹر ہیں اور انسانی فلاحی امور کے لیے کوشاں ہیں۔ انڈیانا وہ شہر ہے جس میں نوٹرے ڈیم یونیورسٹی ہے۔ 'نوٹرے ڈیم' کا مطلب ہے "ہماری خاتون" جو کہ مریم علیہا السلام کی طرف اشارہ ہے۔ چونکہ حضرت مریم علیہا السلام کیتھولک روایت میں ایک اہم شخصیت سمجھی جاتی ہیں، اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ یہ مذہبی عقیدے پر مبنی یونیورسٹی ہے۔ اس کا ایک مذہبی مشن ہے اور اسی وجہ سے، یہ ریاست ہائے متحدہ امریکا کی دیگر بڑی تحقیقی یونیورسٹیوں سے ذرا الگ ہے۔ اس کے جو نظریات ہیں اور جو اصول واقدار اس ادارے نے اپنے لیے وضع کیے ہیں، وہ ان پر سختی سے کاربند ہے۔ یہ ایک ایسا ادارہ ہے جو اپنے تمام امور میں سماجی کیتھولک تعلیمات سے رہنمائی لیتا ہے، اور جن کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ دنیا میں اچھائی اور نیکی کو فروغ دیا جائے۔ دنیا میں اچھائی اور نیکی کے فروغ کا مطلب یہ ہے کہ انسانی ترقی کے لیے سنجیدہ کاوشیں بروئے کار لائی جائیں۔ جب ہم انسانی ترقی کی بات کرتے ہیں تو اس میں صرف معاشی ترقی شامل نہیں ہوتی، بلکہ، ہمیں ان کی روحانی ترقی اور ثقافتی ترقی کے بارے میں بھی سوچنے کی ضرورت ہے۔ انسان تبھی ترقی کر سکتا ہے جب پوری انسانیت کو ذہن میں رکھا جائے، نہ صرف یہ کہ کسی ایک فرد کو یا معاشرے کی اکائی کو۔ انسانی وقار اور انسانی کرامت ہر ثقافت میں ایک مسلمہ پہلو ہے اور اس ادارے میں انسانی ترقی اور انسانی وقار کو عمومی حیثیت میں اہمیت دی جاتی ہے اور یہ اس کا مرکزی محور ہے۔ انسانی بہبود کے حوالے سے تمام مذاہب میں تلقین کی گئی ہے اور تعلیمات دی گئی ہیں۔ لہذا، اس موضوع پر مختلف مذاہب کے نقطہ نظر سے بہت سی گفتگو ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انصاری انسٹی ٹیوٹ، جس کی بنیاد پاکستانی نژاد رفعت

انصاری نے رکھی اور یونیورسٹی کو عطیہ دیا، ان کا ہدف ہے کہ مذاہب کو کس طرح عالمی سطح پر مختلف طبقات کے درمیان پرامن بقائے باہمی کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے، تاکہ مذاہب مل کر انسانی ترقی کے اس نظریے کو آگے بڑھانے کے لیے کام کر سکیں۔ وہ انسانیت کی فلاح کے حوالے سے اس لٹریچر سے متاثر ہوئے جو پوپ فرانسس نے تصنیف کیا، یا جو تعلیمات کیتھولک روایت میں پرانے لوگوں کی طرف سے ملتی ہیں۔ یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ ہمارے اس پروگرام اور منشور میں مذاہب کی خاص اہمیت ہے اور تمام مذاہب کے نمائندگان کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ اپنے نقطہ نظر کو بیان کریں۔ ہم دوسرے مذاہب کے بارے میں اپنی طرف سے کوئی بات کرنے کے بجائے یہ چاہتے ہیں کہ وہ اپنے لیے خود بات کریں۔

مذاہب داخلی طور پر متنوع ہیں، جس کا مطلب ہے کہ تاریخ کے مختلف اوقات میں مختلف مقامات پر مذہب کے مختلف پیروکاروں نے اپنے مذہب پر مختلف طریقے سے عمل کیا ہے، اور اس لیے وہ نہ صرف داخلی طور پر متنوع ہیں بلکہ وہ مسلسل ارتقاء کی جانب گامزن ہیں۔ لہذا ہم جو کرنا چاہتے ہیں اور جو ہمارا ہدف ہے، وہ یہ ہے کہ ہم مخصوص ماحول میں بسنے والی مخصوص کمیونٹیز کے مخصوص مذہبی پیروکاروں سے بات کریں، تاکہ وہ اظہار خیال کر سکیں کہ وہ اپنی روایات کو اپنے نقطہ نظر سے کس طرح آگے بڑھا رہے ہیں یا ان پر کیسے عمل کر رہے ہیں۔ اس کی ایک سادہ سی مثال اسلام کے اندر پائے جانے والے اختلافات ہیں جن کو مختلف طبقات اپنے طریقے سمجھتے ہیں۔ اگر آپ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی میں آتے ہیں، تو آپ کو اسلام کے کچھ مخصوص اصول اور کچھ اقدار نظر آئیں گی جن پر عمل کیا جاتا ہے۔

اگر آپ کیلیفورنیا کے علاقے بروکلن (Brooklyn) میں واقع زیتونہ کالج جاتے ہیں تو آپ حیران رہ جائیں گے کہ یہ بھی اسلام کی ایک نظیر ہے۔ وہاں پر موجود لوگ ایک دوسرے کے ساتھ اور باہر کی کمیونٹیز کے ساتھ جو زیادہ تر مسلمان نہیں ہیں، کس طرح پیش آتے ہیں اور کس طرح بات کرتے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی اگر آپ پاکستان کے کچھ حصوں یا افغانستان چلے جائیں اور وہاں کے مذہبی علماء سے بات کریں تو آپ کو اسلام پر عمل کرنے کا ایک مختلف ماڈل ملے گا۔ یہ سب مختلف معاشرے ہیں جو الگ الگ تصویر پیش کرتے ہیں اور سب کا خیال ہے کہ وہ ٹھیک عمل کر رہے ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام داخلی طور پر تکثیریت کا حامل اور متنوع معاشروں کی مختلف ثقافتوں اور افکار کو اپنے اندر سمونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس لیے جب ہم مذہب اور رمذہب کی متنوع شکلوں کا جائزہ لیتے ہیں تو پھر مسابقت کی دوڑ میں شامل نہیں ہوتے۔ کیونکہ یہ چیز خطرناک ہو سکتی ہے۔ البتہ اگر کسی خطے میں مذہب کی غلط تعبیرات کر کے سخت گیر نقطہ نظر پروان چڑھایا جائے، کسی کو ناحق قتل کر دیا جائے تو ایسے معاملات میں اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ کچھ لوگ یہ کہیں گے کہ کیا طالبان کی مذہبی تعبیر کو بھی اسلامی تنوع کا حصہ سمجھا جائے گا؟ کیونکہ وہ تو انسانی حقوق کی خلاف ورزی کرتے ہیں، تو ہماری رائے ہے کہ کچھ چیزوں پر اختلاف کیا جا سکتا ہے، مگر کسی خطے یا طبقے کو مکمل طور پہ مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک دلچسپ مکالمہ ہے۔ ہمدردی پر مبنی بیانیہ پر یقین رکھتے ہوئے ہم اس طرح کے گروہ کو تعمیری مقصد کے تحت شامل کر سکتے ہیں۔

ہمدردی پر مبنی بیانیہ

ہمدردی پر مبنی بیانیہ کیا ہوتا ہے؟ یہ ایک ایسی شعوری حالت ہوتی ہے کہ جس میں کسی دوسری صورتحال کو دیکھنے، پڑھنے، سننے یا اس سے سے متعلق تصور کرنے کے ذریعے اس حالت کی حقیقی تفہیم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس میں بنیادی چیز یہ ہوتی ہے کہ ہم کسی دوسرے شخص یا صورتحال سے جڑے مسئلے کو ویسے سمجھنے کی کوشش کریں جیسے وہ چاہتا ہے کہ اسے سمجھا جائے۔ مذاہب کی تفہیم کے معاملے میں بھی اسی نظریے کو عمل میں لایا جانا چاہیے۔ ہمدردی پر مبنی بیانیہ ایک جدید تصور ہے اور یہ بالخصوص امریکی تعلیمی اداروں اور پالیسی حلقوں میں بہت عام ہے اور اسے اہمیت دی جاتی ہے۔

20ویں صدی کے دوسرے نصف میں، مذہب کے ماہرین سماجیات نے ایک خیال پیش کیا جسے 'سیکولرائزیشن تھیسس' کہا جاتا ہے۔ اس میں بنیادی تصور یہ تھا کہ جیسے جیسے معاشرے عقلی سوچ کو اپناتے ہیں اور خود کو اس بنیاد پر منظم کرتے ہیں، مذہب کی اہمیت میں کمی آتی ہے۔ تاہم، اس تھیسس پر سوالات کھڑے ہوئے، جیسا کہ تجرباتی شواہد بتاتے ہیں کہ یہ درست نہیں ہے۔ 20ویں صدی کے نصف آخر میں ہونے والے کئی واقعات دلیل ہیں کہ اس تھیسس پر نظرثانی کرنے کی ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر، ایران میں امام خمینی کا عروج، 1980 کی دہائی کے مذہبی تنازعات، مذہبی بنیاد پرستی اور عسکریت پسندی کا ظہور، اور بالآخر 11/9 کے واقعات نے اس بات کی نشاندہی کی کہ مذہب عالمی معاملات میں اب بھی ایک طاقتور عنصر ہے۔

یہاں تک کہ مغربی دنیا میں، جہاں سیکولرائزیشن کو سب سے زیادہ ترقی یافتہ سمجھا جاتا تھا، وہاں بھی مذہب برقرار ہے۔ مسیحی قوم پرستی کی مثالیں سامنے ہیں۔ یہ سب ظاہر کرتی ہیں کہ مذہب معاشرے میں ایک اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ مزید برآں، ہندوستان میں سیاسی ہندو ازم جیسے مظاہر عالمی سیاست میں مذہب کے پائیدار اثر کو مزید واضح کرتے ہیں۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ اقوام متحدہ اور وائٹ ہاؤس جیسے اداروں کے اندر مذہب کے بارے تصرفات، پالیسیوں اور کاموں میں اضافہ ہوا ہے۔ مثال کے طور پر، ریاستہائے متحدہ میں مذہبی آزادی کے سفیر جیسے عہدوں کا متعارف کرایا جانا اور مذہبی طبقات کے ساتھ تعامل جیسے اقدامات عالمی معاملات کی تشکیل میں مذہب کی بڑھتی ہوئی اہمیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ 2001 میں، اقوام متحدہ نے ایرانی صدر کی کوششوں سے متاثر ہو کر تہذیبوں کے مابین مکالمہ شروع کیا تھا، جس کا مقصد متنوع ثقافتوں کے درمیان افہام و تفہیم اور تعاون کو فروغ دینا تھا۔ اس کے بعد، 2010 میں، مذہب اور ترقی کے موضوع پر Interagency Task Force کی تشکیل اور 2018 میں Multifaith Advisory Council کا حالیہ قیام، بین الاقوامی اداروں کے اندر مذہب بارے بڑھتی دلچسپی کی نشاندہی کرتا ہے۔

اگرچہ عالمی معاملات کا تجزیہ کرتے مذہب کے اثرات کی بہت سی مثالیں منفی محسوس ہو سکتی ہیں، لیکن اس کے مثبت اثرات بھی ہیں جن کو تسلیم کرنا ضروری ہے۔ بہبود، صحت کی دیکھ بھال، انسانیت کی مدد، امن اور مفاہمت کو فروغ دینے میں مذہب ایک اہم

کردار ادا کرتا ہے۔ انصاری انسٹی ٹیوٹ خاص طور پر اس مثبت کردار کو متعارف کرانے میں دلچسپی رکھتا ہے۔

اس نکتے کو اجاگر کرنے کے لیے، میں مارٹن لوتھر کنگ جونیئر کی کتاب کی طرف اشارہ کرنا چاہوں گا، ''ہماری سمت کیا ہے: افراتفری یا برادری؟'' (Where Do We Go from Here: Chaos or Community) اس کتاب کے اختتامی باب 'ورلڈ ہاؤس' میں کنگ فصاحت کے ساتھ ہمارے اختلافات کے باوجود انسانیت کے پرامن طور پر ایک ساتھ رہنے کی ضرورت کو بیان کرتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں، ''ہمیں ایک بڑا گھر، ایک عظیم عالمی گھر وراثت میں ملا ہے، جس میں ہمیں ایک ساتھ رہنا چاہیے، سیاہ اور سفید، مشرقی اور مغربی، غیر یہودی اور یہودی، کیتھولک اور پروٹسٹنٹ، مسلمان اور ہندو، سب ایک خاندان کی طرح ہیں۔ ہم ایک دوسرے کو ختم کرکے یا ایک دوسرے کو پس پشت ڈال کر نہیں رہ سکتے۔ ہمیں یہ سیکھنا ہوگا کہ ہم ایک ساتھ مل کر کیسے زندہ رہیں۔''

سوالات وجوابات

سوال:

میں ایک تو، امریکہ میں مذہبی امور کے حوالے سے فنڈنگ اور بجٹ کی پالیسیوں کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔ میرا دوسرا سوال یہ ہے کہ، دوحہ (Doha) اور ھل (Hull) میں منعقدہ Deep Spring Exchange program کے علاوہ آپ بین المذاہب ہم آہنگی کو فروغ دینے کے لیے اور کون سے وسائل و ذرائع استعمال کر رہے ہیں؟

جواب:

ریاستہائے متحدہ میں مذہب کے حوالے سے، ہمارے پاس ایک قانون "اسٹیبلشمنٹ کلاز" کہلاتا ہے، جو مذہبی آزادی کی اجازت دیتا ہے، لیکن ریاست کو سرکاری سطح پر مذہبی نوعیت کا کوئی قانون نافذ کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ لہٰذا، امریکی حکومت مذہبی معاملات میں مداخلت کرنے سے دور رہتی ہے۔ البتہ مذہب کی آزادانہ مشق کو یقینی بنانے کا بہت خیال رکھتی ہے۔ مذہب کی آزادی سے متعلق پالیسیوں کے حوالے سے امریکا میں بڑی بحث ہے۔ اس کی ایک نمایاں مثال یہ ہے کہ جب باراک اوباما نے نیشنل ہیلتھ کیئر ریفارم کو منظور کیا، جس کے تحت تمام اداروں کو لازمی بنیادی صحت کی دیکھ بھال کے ضمن میں، مانع حمل وغیرہ جیسے معاملات میں بھی دیکھ بھال شامل تھی۔ مانع حمل اقدامات کیتھولک سماجی تعلیمات سے متصادم ہیں، جس کے نتیجے میں قانونی چارہ جوئی کی گئی کہ وفاقی حکومت حد سے زیادہ تجاوز کر رہی ہے۔

وائٹ ہاؤس نے ان مسائل کو حل کرنے کے لیے Office of Faith-Based Initiatives دفتر قائم کیا۔ ابتدائی طور پر حکومت نے مذہبی تنظیموں کو مالی امداد دینے سے گریز کیا۔ تاہم، بعد میں اجات دے دی گئی، دلیل یہ دی گئی کہ مذہبی فلاحی تنظیموں کو امداد نہ دینا ان تنظیموں کے خلاف غیر منصفانہ امتیازی سلوک ہے۔ نتیجتاً، حکومت نے آئینی تحفظات کو متوازن کرتے ہوئے ان تنظیموں کے ساتھ بھی شراکت داری شروع کی۔ وائٹ ہاؤس کے اس دفتر کے لیے ایک بجٹ مختص کیا گیا ہے، ساتھ ہی USAID کے اندر بھی ایک دفتر ہے جو مذہبی کمیونٹیز کے ساتھ تعلقات کے فروغ پر کام کرتا ہے۔

2020 کے صدارتی انتخابات کے دوران، ہم نے "عقیدہ اور صدارت" کے عنوان سے ایک پینل ڈسکشن کی میزبانی کی جہاں ہم نے مسیحی لیڈروں کو اپنے نقطہ نظر پیش کرنے کی دعوت دی۔ اسی طرح، Black History Month کے دوران، ہم نے افریقی نژاد امریکی رہنماؤں کو ان کی کمیونٹی کو درپیش مسائل اور سیاہ فام افراد کے چرچ کے کردار پر بات کرنے کے لیے مدعو کیا۔

فکری تنوع پر مکالمے کے حوالے سے ایک حالیہ اقدام میں ایک ایسی کتاب کا انتخاب شامل ہے جو مذہبی روایت سے جڑی ہوئی ہے۔ ہم نے ماحولیات اور آب و ہوا کے موضوع پر بات کرنے کے لیے آسٹریلیا کے ایک مقامی مصنف کو مدعو کیا، اور پھر 10 مختلف مذہبی پس منظر کے نمائندوں کو بھی کتاب پر اپنی رائے پیش کرنے کے لیے مدعو کیا۔

جہاں تک Keough School of Global Affairs میں ہمارے پروگرام کا تعلق ہے، ہم ماسٹر آف گلوبل افیئرز کی ڈگری (MGAD) کراتے ہیں، جسے کئی سالوں سے فنڈ پر چلایا جاتا ہے۔ کچھ شعبوں کو مکمل طور پر فنڈز فراہم کیے جاتے ہیں، جبکہ دیگر شعبوں کو جزوی طور پر فنڈ فراہم کیے جاتے ہیں۔اس پروگرام میں بین الاقوامی امور، عالمی ترقی اور امن کے مطالعے کے موضوعات شامل ہیں۔ ہمارے پاس پاکستان سے بھی طلباء آتے ہیں، اگر آپ ثقافتی تجربات حاصل کر کے اپنے افق کو وسیع کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں، تو ہمارے پروگرام کا حصہ بن سکتے ہیں۔

آسٹریلیا میں اسلام: تاریخ، مذہبی ہم آہنگی اور چیلنجز

نیل ہاکنز (Neil Hawkins)

نیل ہاکنز اسلام آباد میں آسٹریلیا کے ہائی کمشنر ہیں۔ وہ اسلامی ثقافت اور عربی زبان وادب پر عبور رکھتے ہیں۔ اس سے قبل وہ سعودی عرب اور مصر کے لیے سابق ہائی کمشنر اور سفیر بھی رہ چکے ہیں۔ اس لیکچر میں انہوں نے آسٹریلیا میں مسلمانوں کی تاریخ کو محور بنایا ہے۔ اس کے ساتھ وہاں پر مسلم ثقافتی مظاہر اور مسلمانوں کے لیے مقامی حکومت کے اقدامات پربھی بات کی ہے۔

علوم اسلامیہ اور مسلمانوں سے متعلق میری دلچسپی کی وجہ

میرا نام نیل ہاکنگز ہے اور میں اسلام آباد میں آسٹریلیا کا ہائی کمشنر ہوں۔ یونیورسٹی میں، میں نے عربی اور اسلامیات کی تعلیم حاصل کی، جس نے مجھے عربی بولنے، لکھنے اور پڑھنے کے قابل بنایا۔ اسلام میں میری دلچسپی کا آغاز میرے والد کی اقوام متحدہ کے مغربی حصے، غزہ، اردن، لبنان اور شام میں فلسطینی پناہ گزینوں کے ساتھ 26 سالہ خدمات سے ہوا۔ اس لیے اسلام کے بارے میں بات کرنا میرے لیے بہت خوشی کی بات ہے۔ میں آسٹریلیا کے تجربے پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے اسلام اور کثیر الثقافتی مظاہر پر بات کروں گا۔

اگرچہ آسٹریلیا رقبے کے لحاظ سے بہت بڑا ملک ہے، لیکن اس کی آبادی 25 ملین ہے، اس کی کل آبادی کراچی کی آبادی جتنی ہے۔ آسٹریلیا ایک کثیر الثقافتی معاشرہ ہے جس

میں مختلف ثقافتوں کے لوگ ہم آہنگی سے رہتے ہیں۔ ثقافتی تنوع ایک ایسی طاقت ہے جسے پاکستان اور آسٹریلیا، دونوں ممالک کو کوشش کرنی چاہیے کہ وہ اس کو یقینی بنائیں اور اس کا تحفظ کریں۔ میں آپ کے سامنے اسلام اور کثیر الثقافتی مظاہر کے بارے میں آسٹریلیا کے تجربے کو سامنے رکھنا چاہوں گا۔

آسٹریلیا میں مسلمانوں کی تاریخ

آسٹریلیاں کی کل آبادی کا نصف حصہ، یعنی تقریبا 12 ملین لوگ ایسے ہیں جن کے والدین میں سے کوئی ایک کسی غیر ملک میں پیدا ہوا اور پھر آسٹریلیا منتقل ہوا تھا۔ میں خود انگلینڈ میں پیدا ہوا اور پھر جب میں چھوٹا تھا تو میرے والدین آسٹریلیا چلے گئے۔ لہذا، اتنی بڑی تعداد میں لوگ مختلف 200 ممالک سے آئے ہوئے ہیں اور ایک ملک میں رہتے ہیں اور تقریباً 400 زبانیں بولتے ہیں۔ ملک کی 20 فیصد آبادی گھروں میں انگریزی کے علاوہ کوئی اور زبان بولتی ہے۔ مذہبی طور پر متنوع معاشرے کی بات کی جائے تو آسٹریلیا میں 3 فیصد سے زیادہ مسلمان ہیں اور وہاں اسلام دوسرا سب سے زیادہ عام اور سب سے تیزی سے پھیلنے والا مذہب ہے۔ اسلام آسٹریلین معاشرے کا ایک ضروری حصہ ہے۔ آسٹریلیا کے وزراء میں سے ایک مسلم وزیر فاطمہ ہے جس کا اصل تعلق افغانستان سے ہے، ایک اور وزیر عزہ علی ہیں، جس کا تعلق مصر سے ہے، جو ملک میں نمایاں کردار ادا کر رہی ہیں۔ ایک اور چیز جس کا میں ذکر کرنا چاہوں گا کہ اگر کوئی مسلمان آسٹریلیا کے کسی کالج میں پڑھ رہا ہے تو اس کو بائبل کا مطالعہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اسے قرآن پڑھایا جائے گا۔ آسٹریلیا کا اسلام سے تعلق 1860 کی دہائی سے

ہے، جب افغانی اور پاکستانی اونٹ آسٹریلیا لائے گئے تھے۔ ریلوے کے آنے سے پہلے شہروں کے درمیان سامان کی نقل و حمل میں اونٹ ایک بنیادی ذریعہ تھے۔ اب بھی آسٹریلیا میں ایک ملین جنگلی اونٹ موجود ہیں، جو اصل میں پاکستان سے ہیں اور انہیں ریلوے کے آنے کے بعد آزاد چھوڑ دیا گیا۔

آسٹریلیا میں مسلم ثقافتی مظاہر

اگر آپ سڈنی (Sydney) یا میلبورن (Melbourne) جائیں تو آپ کو وہ آسٹریلوی لوگ نظر آئیں گے جو شلوار قمیض پہنے ہوں گے اور وہ آپ کو غیر ملکی نہیں لگیں گے۔ تقریباً 15,000 پاکستانی طلباء آسٹریلیا کے تعلیمی ڈھانچے میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ لہذا، میرا مقصد آسٹریلوی معاشرے پر کثیر ثقافتی اور اسلام کے مثبت اثرات اجاگر کرنا ہے۔ آسٹریلیا میں بہت سے اسلامی اسکول ہیں جہاں حکومت مسلم لڑکے اور لڑکیوں کی مدد کرتی ہے۔ مسیحیوں اور مسلمانوں کے لیے سرکاری اسکول ہیں۔ ساؤتھ ویلز میں 28 اسلامی اسکول ہیں جن میں تقریباً 20,000 مسلمان طلبہ زیر تعلیم ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ مساجد، امام اور حلال خوراک آسٹریلوی مسلم کمیونٹی کا حصہ ہیں۔ آسٹریلیا میں، بلاشبہ اب بھی چیلنجز برقرار ہیں، بہت سے لوگوں کو امتیازی سلوک اور نسل پرستانہ رویوں کا سامنا ہوتا ہے۔ اس سے نمٹنے کے لیے کوششیں جاری ہیں۔ آسٹریلوی حکومت، انسانی حقوق کمیشن کے ذریعے رپورٹس کی جانچ پڑتال کر رہی ہے۔

حالیہ رپورٹس کے نتائج میں تجویز پیش کی گئی، کہ میڈیا میں مسلمانوں کی زیادہ نمائندگی کی ضرورت ہے۔ خوش قسمتی سے آسٹریلیا میں ولید علی اور ان کی اہلیہ آسٹریلین میڈیا

کی بہت ممتاز شخصیات ہیں، جو آسٹریلوی معاشرے کو تعلیم اور معاشرتی آگاہی دینے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اگرچہ چیلنجز اب بھی برقرار ہیں لیکن آسٹریلیا میں 75 فیصد مسلمان خود کو آسٹریلوی محسوس کرتے ہیں۔ عوامی آگاہی مہم کے ذریعے اور امتیازی سلوک کے خلاف تحفظ کے لیے مضبوط قوانین کی تشکیل کے ساتھ، تحفظ فراہم کرنے اور مسلمانوں کو آسٹریلیا میں گھر جیسا محسوس کرانے کی کوششیں جاری ہیں۔

آسٹریلیا کے لوگوں کو کھیل پسند ہیں، میں نے حال ہی میں راولپنڈی میں ہاکی کھیلی۔ آسٹریلیا میں، ہر کوئی کسی نہ کسی کھیل سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ ہمارے پاس ایک مشہور مسلمان رگبی[1] کھلاڑی ہے جس کا نام بشر علی ہے۔ ایسی شخصیات اسلام کی ترویج اور کمیونٹی کے اندر امن کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کر رہی ہیں۔ آسٹریلیا میں ایک پہلو اس کے خوبصورت ساحل ہیں، جو دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ بہت سے لوگ لطف اندوزی کے لیے ساحلوں پر جاتے ہیں، لیکن مسلمان خواتین کے لیے یہ مشکل ہوتا ہے کیونکہ وہ بکینی نہیں پہن سکتیں۔ آسٹریلیا میں، مسلم خواتین کے لیے برقینی ڈیزائن کی گئی ہے، جس سے وہ روایتی لباس میں سوئمنگ کر کے مطمئن محسوس کریں۔ مسلم خواتین کو اطمینان کا احساس دلانے کے لیے یہ آئیڈیا عالمی سطح پر بہت سے ممالک نے اپنایا ہے۔

---

[1] رگبی ایک کھیل ہے جس میں کھلاڑی گیند ہاتھ میں لے کر دوڑتے ہیں۔ یہ کھیل میں 15 کھلاڑیوں کی دو ٹیموں کے درمیان بیضوی شکل کی گیند کا استعمال کرتے ہوئے کھیلا جاتا ہے۔

مسلم خواتین تیرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتی تھیں، جس کی وجہ سے ڈوبنے کی شرح میں اضافہ ہوا۔ اس سے نمٹنے کے لیے، آسٹریلیا نے خاص طور پر خواتین کے لیے مخصوص اوقات میں سوئمنگ پول قائم کیے۔ انہوں نے خواتین کو تیراکی کی تربیت دینے میں مدد کی، خاص طور پر ان کے لیے جو مخلوط طور پہ تیرنا پسند نہ کرتی ہوں۔ میرا ایک دوست ہے جو پہلے آسٹریلیا میں سفیر رہا اور اب جدہ میں قائم اسلامی تعاون تنظیم کے خصوصی نمائندے کے طور پر خدمات انجام دے رہا ہے۔ وہ اسلامی تعاون تنظیم میں آسٹریلوی مسلمانوں کی نمائندگی بھی کر رہا ہے۔ وہ نو سال کی عمر میں جنوبی افریقہ سے آسٹریلیا آیا تھا۔ اب، وہ اور ان کا خاندان ایک سفیر کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ، آسٹریلیا میں مسلم خواتین فوج اور پولیس میں بھی خدمات انجام دے رہی ہیں۔

ایک سفیر کے طور پر ثقافتی تبادلے کو فروغ دینا میرے لیے اہم ہے اور اس میں بہت خوشی بھی محسوس کرتا ہوں۔ میرے لیے یہ ضروری ہے کہ میں پاکستان میں تمام کمیونٹیز کے ساتھ منسلک رہوں، بین المذاہب ہم آہنگی اور خواتین کے حقوق سے متعلق خیالات کو سننا اور ان کو فروغ دینا میرے کام کا حصہ ہے۔ ہم بستیوں میں بچوں کے لیے رمضان میں افطاری جیسی تقریبات کا اہتمام کرتے ہیں، جو امن اور اتحاد کو فروغ دیتی ہیں۔

میری رائے کے مطابق، ایک کامیاب معاشرہ برداشت اور تنوع پر انحصار کرتا ہے۔ اگرچہ کچھ لوگ اسے ایک مسئلہ سمجھتے ہیں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہی ہماری اصل طاقت ہے۔ میں آخر میں حضرت علیؓ سے منسوب ایک روایت کا حوالہ دوں گا کہ "لوگ یا تو دین میں تمہارے بھائی ہیں یا انسانیت میں تمہارے بھائی"۔ اس سے بالاتر کہ

کون کہاں سے آیا ہے، ہر کوئی مذہب میں یا انسانیت میں ایک دوسرے کے لیے بھائی بہن ہے۔

عالمی تناظر میں علاقائی استحکام، پاک افغان سرحدی مسائل

الیگزینڈرا گانٹ(Alexandra Gaunt)

الیگزینڈرا گانٹ پاکستان میں برطانوی ہائی کمیشن کے زیراہتمام شعبہ'علاقائی استحکام' کی سربراہ کے طور پہ کام کرتی ہیں۔اس لیکچر میں انہوں نے پاکستان اور افغانستان کے درمیان تعلقات کی پیچیدگیوں کو موضوع بنایا ہے۔ اس کے علاوہ خطے میں چین، بھارت اور پاکستان کے اپنے اپنے مفادات اور درپیش خدشات پر بھی گفتگو کی ہے۔

خطے کی صورتحال اور خدشات

میں علاقائی اتھارٹی کی ٹیم برٹش ہائی کمیشن کے سربراہ کے طور پر گزشتہ اکتوبر میں پاکستان آئی،اور تب سے میں نے مشترکہ تاریخ اور ثقافت کی بدولت اس ملک کے ساتھ تعلق کا ایک منفرد احساس پایا ہے۔ علاقائی ٹیم، جو غیر ملکی رہنماؤں کے ساتھ پاکستان کے تعلقات کا تجزیہ کرنے کی ذمہ دار ہے، وسیع پیمانے پر افغانستان پر توجہ مرکوز کرتی ہے۔اس ٹیم میں 50 سے زائد اراکین شامل ہیں، جن میں نصف سے زیادہ افغان امور کے لیے کام کرتے ہیں۔ عالمی تناظر میں علاقائی استحکام پر بات کی جائے، تو یہ واضح ہے کہ ہم تیزی سے بدلتے ہوئے منظر نامے کی طرف منتقل ہو رہے ہیں، جو غیر متوقع نوعیت کا ہے۔

جغرافیائی طور پر، چین کی اٹھان، امریکہ اور چین کے تعلقات میں شدت، اور اس خطے پر افغانستان سے امریکی انخلاء کے اہم اثرات کو ہم گہرائی سے مطالعہ کرتے ہیں۔ بحیرہِ ہند کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ ہندوستان نے حال ہی میں آبادی کے لحاظ سے چین کو پیچھے چھوڑ دیا ہے، جس نے ابھرتی ہوئی حرکیات میں ایک اور تہہ کا اضافہ کیا ہے۔ عالمی سطح پر بڑھتے ہوئے عدم استحکام اور اس سے جنم لینے والی تبدیلیوں کے پیش نظر، جس کی نشان دہی بڑھتے ہوئے تنازعات سے کھل کر سامنے آتی ہے، پاکستان جیسے درمیانی طاقت کے حامل ملک خود کو کمزور پڑتا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ اس صورت حال میں ابھرتے ہوئے جغرافیائی سیاسی منظر نامے کے درمیان توازن برقرار رکھنا بہت ضروری ہو جاتا ہے۔ عالمی معیشت پر COVID-19 کے اثرات اور روسی-یوکرین بحران، اگرچہ اب بھی یورپ کے لیے خصوصا ایک بڑا مسئلہ ہے جس سے خوراک اور توانائی کا توازن متاثر ہوا ہے۔

علاقائی استحکام سے جڑے امور پر توجہ مرکوز کرنا اہمیت کا حامل ہے۔ یہاں ایشیائی خطے میں جنم لینے والے ممکنہ تنازعات خاص طور پر بھارت، چین کشمکش میں یہ خطرہ موجود ہے کہ یہ طاقتیں کسی غلط حساب کتاب میں کوئی قدم نہ اٹھالیں۔ دو جوہری طاقتوں کے درمیان کسی بھی غلطی کے پورے خطے اور اس کے پڑوسیوں کے لیے تباہ کن نتائج ہو سکتے ہیں۔

تیزی سے بڑھتی ہوئی ایشیائی معیشتوں، یورپ اور مغرب کی منڈیوں کے درمیان ایک اہم تجارتی لنک کے طور پر پاکستان کا اسٹریٹجک مقام اور اہمیت ایک مثبت شے ہے۔ اس تناظر میں خاص طور پر پاک افغان تعلقات میں استحکام کی ضرورت پر زور دینا ضروری ہے۔ تاریخی چیلنجز کے باوجود، پرامن بقائے باہمی کو فروغ دینا، تجارتی تعلقات کے لیے

کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ پاکستان افغانستان کی سمندری تجارت کے لیے ایک اہم راستے کے طور پر کام آسکتا ہے، جب کہ افغانستان پاکستان کی ترقی کے لیے خام مال فراہم کرتا ہے۔ تاہم، ٹی ٹی پی (تحریک طالبان پاکستان) جیسے گروہوں کا مستقل خطرہ چیلنجز کا باعث بنتا ہے، جس سے عوامی تناؤ اور دونوں ممالک کے درمیان اعتماد کی کمی پیدا ہوتی ہے۔ مزید تنازعات کو روکنے اور طویل مدتی استحکام کے لیے اعتماد پیدا کرنے کے لیے شدت پسند گروہوں سے جڑے سکیورٹی خدشات کو دور کرنا ناگزیر ہے۔

پاک افغان تنازعات

پاکستان اور افغانستان کے درمیان سرحدی تنازعات اور تجارتی مسائل ایک بڑی مشکل ہیں جن کے باعث تناؤ رہتا ہے۔ عوامی سطح پر بھی لوگ متاثر ہوتے ہیں، خاص طور پر پاکستان میں علاج کے خواہشمند افغانوں کے لیے طبّی رسائی ایک مسئلہ بن جاتی ہے۔ اس سرحد پر چھوٹے بڑے متعدد مسائل ہیں جو حل طلب ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ استحکام کیسے حاصل کیا جاسکتا ہے، اور خطے کے ممالک سمیت عالمی برادری کیا کردار ادا کر سکتی ہے؟

سب سے پہلے، سفارتی کوششیں ضروری ہیں، جن میں اختلاف کرنے والے فریقوں کو ساتھ بٹھانا ہوگا چاہے یہ جتنا بھی ناممکن لگے۔ اپنے اپنے مفادات کے باوجود، انسانی ہمدردی کی بنیاد پر امداد، دہشت گردی کا مقابلہ، اور اقلیتوں، خواتین اور لڑکیوں کے حقوق جیسے مشترکہ مسائل وخدشات پر اتفاق بہت ضروری ہے۔ افغانستان کے حالیہ

کچھ اقدامات چیلنجز کا باعث ہیں، لیکن سفارتی کوششیں بروئے کار لانا ایک ضرورت ہے۔

پاکستان اس تناظر میں ایک کلیدی حیثیت رکھتا ہے، جس کے افغانستان کے ساتھ تاریخی طور پر قریبی تعلقات ہیں۔ پاکستان صورتحال کی تفہیم اور بات چیت میں سہولت کاری فراہم کرنے میں عالمی برادری کی مدد کے لیے تیار ہے۔ معلومات کی غلط رسائی ایک مسئلہ ہے جسے بات چیت سے ختم کیا جاسکتا ہے۔ مختلف نقطہ نظر کو سمجھنے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے، خاص طور پر خواتین اور لڑکیوں کے حقوق، تعلیم، اور جامع طرز حکمرانی سے متعلق امور پر مکالمہ ہو سکتا ہے۔

جہاں تک پاک افغان تنازعے کی بات ہے، تو اس میں اگرچہ عالمی برادری افہام و تفہیم کے لیے کوششیں کر سکتی ہے اور بات چیت کے مواقع فراہم کر سکتی ہے، لیکن حتمی حل پاکستانی اور افغان حکام کے ہاتھ میں ہے۔ بہتر افہام و تفہیم کی حوصلہ افزائی سے انسانی بحران کو مزید بگڑنے سے روکا جا سکتا ہے اور مایوس کن فیصلوں کی حوصلہ شکنی کی جانی چاہیے جو تنازعات کو جنم دیتے ہیں۔

نہ صرف افغانستان اور پاکستان کے تعلقات، بلکہ وسیع تر علاقائی روابط پر زور دینا بہت ضروری ہے۔ استحکام کو فروغ دینے کے لیے ان مواقع سے فائدہ اٹھانا بہت ضروری ہے جو دستیاب ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ درپیش چیلنجز فطری ہیں، لیکن ان کی تفہیم پر توجہ مرکوز کرنا اور بتدریج ان سے نمٹنے کی پالیسی بنانا ناگزیر ہے۔

سوالات وجوابات

سوال : جنوبی ایشیائی اور وسطی ایشیائی خطہ تجارت، منڈیوں اور وسائل کی وجہ سے بڑی طاقتوں کے لیے اہم ہے۔ سارک ممالک کی طرف سے امن اور استحکام لانے کی کوششوں کے باوجود کچھ چیلنجز موجود ہیں۔ امریکہ، روس، چین اور برطانیہ جیسے بڑے ممالک نے برطانوی نوآبادیاتی ماضی سمیت تاریخی تعلقات کو مدنظر رکھتے ہوئے علاقائی استحکام اور اس خطے میں انسانی بحرانوں سے نمٹنے کے لیے اپنا اثر ورسوخ کیوں نہیں استعمال کیا؟

جواب : میرا ماننا ہے کہ مغربی طاقتیں، بشمول برطانیہ کے، چین، ہندوستان اور پاکستان کی جوہری صلاحیتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے، یہاں استحکام کو فروغ دینے میں حقیقی طور پر دلچسپی رکھتی ہیں۔ جوہری طاقتیں ہونے کی وجہ سے یہاں غلط حساب کتاب اور غلط اقدام کے خدشات موجود ہیں، جس سے نہ صرف یہ خطہ، بلکہ عالمی منظر نامہ بھی عدم استحکام اور ہتھیاروں کی دوڑ اور مقابلے سے متاثر ہو رہا ہے۔

مغربی ممالک افغانستان میں اپنے تاریخی کردار اور یہاں کی پیچیدگیوں کو تسلیم کرتے ہیں، لیکن بہر حال خطے میں تنازعات کا حل بالآخر ان اقوام پر ہی منحصر ہے جو اس کا حصہ ہیں۔ اگرچہ بین الاقوامی برادری مذاکرات میں مدد اور سہولت کاری فراہم کر سکتی ہے، لیکن پاکستان اور افغانستان جیسی قوموں کو اپنے مسائل کے حل کے لیے ذاتی کوششوں اور صلاحیتوں سے کام لینا چاہیے۔ پاک بھارت تنازعہ، خاص طور پر کشمیر کے مسئلے میں حل خود ان دونوں ملکوں کے پاس ہے۔ اقوام کے پاس ہے۔ پاکستان کے پرانے دوست

ہونے کے ناطے، برطانیہ مشاورت فراہم کرنے کے لیے پر عزم ہے، لیکن علاقائی مسائل کے حل آخر کار خطے کے ممالک کے پاس ہی ہے۔

سوال : بھارت اور چین سمیت بڑی طاقتیں جنوبی ایشیائی اور وسطی ایشیائی خطے کے مسائل کو مؤثر طریقے سے حل کرنے میں کیا کردار ادا کر سکتی ہیں؟

جواب :ہندوستان اور چین کے درمیان ایک واضح مسابقت کی فضا ہے، جس میں کبھی کبھار تناؤ آجاتا ہے۔ان اختلافات کے باوجود، بین الاقوامی برادری، بشمول ہندوستان اور چین کے، سبھی انسداد دہشت گردی، اور انسانی حقوق کو فروغ دینے جیسے ضروری پہلوؤں پر متفق ہیں۔اگرچہ طالبان کی حکومت کو تسلیم کرنے پر دنیا میں کوئی اتفاق رائے موجود نہیں ہے، لیکن چین اور بھارت سمیت بڑی طاقتوں کے لیے نجی سطح پر کچھ مواقع موجود ہیں، خاص طور پر تجارتی مسائل اور طالبان کے ساتھ تعلقات کے حوالے سے وہ اقدامات کر سکتے ہیں۔ان مواقع کے باوجود، فی الحال اس بات کا کوئی امکان نہیں ہے کہ کوئی بڑی طاقت طالبان کو سرکاری طور پر تسلیم کرنے کے لیے تیار ہے۔ایک مغربی مبصر کے طور پر، چین اور بھارت کے نقطہ نظر کو درست طریقے سے سمجھنا مشکل ہے، لیکن ابھی تک،ان ممالک کی طرف سے طالبان کو فوری طور پر تسلیم کرنے کے کوئی آثار نظر نہیں آرہے ہیں۔

سوال : بریگزٹ Braxit کا جنوبی ایشیائی ممالک، بالخصوص پاکستانی طلباء اور ویزا کے عمل پر کیا اثر پڑے گا؟مزید برآں، شہریت کے سخت قوانین پاکستانیوں کے لیے چیلنجز کا باعث ہیں۔ برطانیہ ان افراد کے خدشات کو کیسے دور کر سکتا ہے جنہیں دہشت

گردی کے خلاف جنگ جیسے حالات کی وجہ سے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے؟

جواب : بریگزٹ واقعی برطانیہ میں اہم تبدیلیوں کا سبب بنا ہے، جس سے یورپی یونین کی رکنیت کے 40 سال بعد تجارت اور تعلقات متاثر ہوئے ہیں۔ البتہ پاکستان پر مجموعی طور پر اثر کوئی اتنا نہیں پڑا ہے۔ طلباء کے ویزوں سے متعلق مجھے زیادہ معلومات اور مہارت نہیں ہے۔ چیلنجز کے باوجود، ہم امید کرتے ہیں کہ برطانیہ ایک کثیر الثقافتی ملک رہے گا۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ کے منفی اثرات کو تسلیم کرتے ہوئے، مغرب میں یہ تسلیم کیا جارہا ہے کہ اسلاموفوبیا کوئی مذہبی مسئلہ نہیں ہے۔ اگرچہ چیلنجز برقرار ہیں، لیکن مغربی سوچ میں تبدیلی آرہی ہے۔ مشکلات کا سامنا کرنے والے افراد، خاص طور پر پاکستانیوں کے خدشات کے حوالے سے اور انسانی بحرانوں سے نمٹنے کے لیے پالیسیاں بنانا ضروری ہے۔

شہریت کے مسائل اور ویزوں کے بارے میں خدشات کو سمجھنا اور پالیسیاں بنانا ضروری ہے۔ بڑے پیمانے پر نقل مکانی کو روکنے اور ملک کے اندر استحکام کو فروغ دینے کے لیے افغانستان میں انسانی بحران پر توجہ دینا ہوگی۔ سیاسی بات چیت جاری ہے، تو پیش رفت میں وقت لگ سکتا ہے، لیکن ان مسائل کو حل کرنا ایک زیادہ جامع اور انسانیت کے لیے ہموار مستقبل کی تعمیر کے لیے ضروری ہے۔

سوال : آپ پاکستان اور سعودی عرب کے تعلقات کو علاقائی استحکام اور سفارت کاری کے تناظر میں کیسے دیکھتے ہیں؟

جواب :اس وقت، پاکستان سیاست، معیشت اور سلامتی میں عدم استحکام کے ساتھ

اندرونی چیلنجز کا سامنا کر رہا ہے۔ روایتی طور پر سعودی عرب، خاص طور پر معاشی حوالے سے پاکستان کا معاون اور دوست رہا ہے۔ تاہم، تبدیل ہوتی سیاسی صورتحال نے بیرونی شراکت داروں کو محتاط رویہ اپنانے پر مجبور کیا ہے۔

مشرق وسطیٰ کی صورتحال میں، سعودی عرب اور ایران کے مابین تناؤ، پیچیدگی میں اضافہ کرتے ہیں۔ سعودی عرب اور ایران کے درمیان تعلقات میں حالیہ نرمی ایک مثبت پیش رفت ہے، جو علاقائی استحکام میں معاون ہے۔ یہ ابتدائی قدم ہے، ہم کو آگے دیکھنا ہوگا کہ کیا ہوتا ہے۔

سوال : آپ گزشتہ 20 سالوں میں پاکستان اور افغانستان میں ہونے والے مالی اور انسانی بحرانوں کے لیے امریکہ کے ساتھ ساتھ برطانوی حکومت کو کس حد تک ذمہ دار ٹھہراتے ہیں؟ آپ نے افغانستان کے ساتھ تعلقات ختم کیے اور انہیں دہشت گرد قرار دیا، لیکن "تعلیمی حقوق" اور "خواتین کے حقوق" جیسے مسائل جن پر آپ لوگ بہت زور دیتے ہیں، انہیں آپ کیسے حل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟

جواب :الزام تراشی کا کھیل کا امن اور استحکام کے تناظر میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔ تاریخی غلطیوں کو تسلیم کرتے ہوئے، آگے بڑھنے پر توجہ مرکوز کرنا زیادہ نتیجہ خیز ہوتا ہے۔ بین الاقوامی برادری بشمول برطانیہ کو دوحہ معاہدے سے توقعات وابستہ تھیں۔ عالمی سطح پر حقوق کا ایک کم از کم معیار طے ہے جس پر تمام اقوام کو عمل پیرا ہونا چاہیے، جس میں خواتین کے حقوق کا احترام اور جامع طرز حکمرانی کو فروغ دینا بھی شامل ہے۔

افغانستان کے معاملے میں، طویل مدتی استحکام کے حصول کے لیے داخلی حکمرانی کے مسائل، عالمی بینکنگ نظام میں دوبارہ انضمام، اور قبائلی کشیدگی سے نمٹنے کی ضرورت ہے۔ یہ عمل افغان عوام کے ساتھ ایک مشترکہ کوشش کے طور پہ ہونا چاہیے، اور عالمی برادری معاون کا کردار ادا کر سکتی ہے۔ مقصد افغانستان کی کامیابی ہے، لیکن اس کے لیے دو طرفہ تعاون کی ضرورت ہے، جس میں حکومتیں بین الاقوامی معیارات پر پورا اتریں۔ برطانیہ ان اہداف کے لیے کام کرنے والی قوموں کے ساتھ کھڑا ہے، اس بات کو تسلیم کرتے ہوئے کہ کامیابی کا انحصار باہمی عزم اور متفقہ اصولوں کی پاسداری پر ہے۔

سوال : آپ ایشیائی ممالک بالخصوص پاکستان کے مستقبل کو کیسے دیکھتے ہیں، اور کیا عالمی جنگ عظیم سوم کا کوئی امکان ہے، کیونکہ طاقت کا عالمی توازن یک قطبی سے دو قطبی اور اب کثیر قطبی ڈھانچے کی طرف منتقل ہوتا ہے؟

جواب : مستقبل کی پیشین گوئی کرنا، خاص طور پر موجودہ جغرافیائی سیاسی منظر نامے میں، ایک چیلنجنگ کام ہے۔ پاکستان کے حوالے سے سیاسی، سیکورٹی اور اقتصادی شعبوں میں غیر یقینی صورتحال موجود ہے۔ غیر متزلزل سیاسی صورتحال، ٹی ٹی پی اور داعش خراسان جیسے گروہوں کی جانب سے سیکیورٹی چیلنجز، اور معاشی خدشات، ایک پیچیدہ منظر نامہ تشکیل دیتے ہیں۔ اگرچہ قلیل مدتی امکانات بہت زیادہ پر امید نہیں لگتے، لیکن امید ختم نہیں کرنی چاہیے، اور صورتحال بدل سکتی ہے۔

جہاں تک جنگ عظیم سوم کے امکان کا تعلق ہے، یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر برسوں سے بحث ہوتی رہی ہے۔ طاقت کا بدلتا ہوا عالمی توازن، تکنیکی ترقی، اور تنازعات کے امکانات کے سبب امن کو خطرات تو لاحق ہیں۔ اگرچہ کوئی بھی اس طرح کے تباہ کن حادثے کی خواہش نہیں کرتا، لیکن دنیا میں تنازعات بڑھ رہے ہیں۔ جنگ کے خطرات کو کم کرنے اور استحکام کو فروغ دینے کے لیے سفارت کاری اور بین الاقوامی تعاون بہت اہم ہو جاتا ہے، جیسا کہ افغانستان اور پاکستان کے تناظر میں دیکھا جاتا ہے۔

سوال: آپ لندن میں معاشرے کے ارتقاء کو کیسے دیکھتے ہیں؟، خاص طور پر، 11/9 کے بعد مسلم آبادی کو درپیش مسائل اور دہشت گردی کے خلاف جنگ کے بارے میں؟

جواب :ایک کثیر الثقافتی ماحول میں پرورش پاتے ہوئے، میں نے لندن میں چیلنجز اور تبدیلیوں کا کافی مشاہدہ کیا ہے، خاص طور پر مسلم آبادی کے حوالے سے، اور 11/9 کے بعد اور دہشت گردی کے خلاف جنگ کے دوران۔ ان واقعات کے نتیجے میں مشکلات پیدا ہوئیں، جس میں مسلم کمیونٹی کو نشانہ بنایا گیا۔ تاہم، میں ایک تبدیلی دیکھ رہی ہوں، خاص طور پر نوجوان نسل میں، جو ایک جیسے جذبات نہیں رکھتے۔ فی الحال، برطانیہ میں تنوع کے تحفظ کے حوالے سے بات چیت جاری ہے، جس میں عملی پہلوؤں جیسے کہ انضمام، نرمی، اور آنے والی نئی کمیونٹیز کی تعلیم پر توجہ دی جا رہی ہے۔ عصر حاضر میں ان چیلنجز کے باوجود، دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ، کمیونٹیز عام طور پر اچھی طرح سے ایک ساتھ رہتی ہیں۔

سوال : امریکہ میں طلباء کو درپیش چیلنجز، خاص طور پر اسلاموفوبیا سے متعلق مسائل کو کم کرنے یا ختم کرنے اور طلباء کے لیے مزید بہتر ماحول پیدا کرنے کے لیے ہائیر کمیشن کیا اقدامات کر رہا ہے، اور حکام کی جانب سے کیا کوششیں کی جا رہی ہیں؟

جواب : برطانیہ میں، نسلی اور مذہبی بدسلوکی کو روکنے کے قوانین موجود ہیں، تاکہ ہر ایک کے ساتھ منصفانہ سلوک کیا جائے۔ قانونی نظام فعال طور پر ان قوانین کو نافذ کرنے میں مصروف ہے، اور ثقافتی ادارے بھی ایسے مسائل کو حل کرنے کے لیے کام کرتے ہیں۔ اگرچہ عملی سطح پر کچھ مشکلات ہو سکتی ہیں، مگر برطانیہ امتیازی سلوک کے خلاف صفر رواداری کی پالیسی رکھتا ہے۔ امتیازی سلوک کا مقابلہ کرنے کے عزم کی عکاسی کرتے ہوئے ایک جامع اور روادار ماحول پیدا کرنے کے لیے مسلسل کوششیں کی جاتی ہیں۔

سوال : اسرائیل اور فلسطین کے درمیان جاری تنازعات، عبادت گاہوں پر مسلسل حملوں کے پیش نظر، اس معاملے پر برطانیہ کا موقف کیا ہے؟ کیا اس معاملے کو باقی دنیا کے ساتھ حل کرنے یا اقوام متحدہ میں فلسطین کے موقف کی حمایت کرنے کا کوئی منصوبہ ہے؟

جواب : میری مہارت ایشیائی خطے کے حوالے سے ہے۔ اگرچہ میں اسرائیل۔فلسطین کی صورتحال پر طویل گفتگو کر سکتی ہوں، مگر یہ میرا شعبہ نہیں ہے۔ برطانیہ ہر تنازعے کے پرامن حل کا خواہاں ہے۔ مگر جہاں تک اسرائیل اور فلسطین کے حوالے سے

مخصوص اقدامات یا منصوبوں کا تعلق ہے، تو میں اس پر کوئی تفصیلی نقطہ نظر فراہم نہیں کر سکتی، کیونکہ میرا اختصاصی شعبہ یہ خطہ ہے۔

بھارت افغانستان ثقافتی سفارت کاری: ایک اضافی تبصرہ

نچلی سطح پر عوام کے عوام کے ساتھ رابطے بہت اہم ہوتے ہیں۔ ثقافتی سفارت کاری، بشمول کرکٹ جیسے شعبے، اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ خاص طور پر نوجوان افراد کے درمیان، ثقافتی تبادلوں کو فروغ دینا وقت کے ساتھ ساتھ مثبت تبدیلی میں حصہ ڈال سکتے ہیں۔ ہندوستان اور افغانستان کے درمیان افہام و تفہیم اور تعاون کو بڑھانے کے لیے اس طرح کے ثقافتی رابطوں کی حوصلہ افزائی ضروری ہے۔

ثالثی کے عمل میں اقوام متحدہ کا کردار

ڈاکٹر لوری ناتھن(Dr. Laurie Nathan)

ڈاکٹر لوری ناتھن نوٹرے ڈیم یونیورسٹی کے زیراہتمام شعبہ 'ثالثی پروگرام' کے ڈائریکٹر ہیں۔وہ اقوام متحدہ کے ادارے کے تحت بھی کئی ممالک میں کام کرچکے ہیں۔ اس لیکچر میں انہوں نے دنیا میں پائے جانے والے بڑے تنازعات میں ثالثی کے عمل کی نوعیت پر بات کی ہے۔ اس کے علاوہ اقوام متحدہ کو اس عمل میں جو مشکلات پیش آتی ہیں،یا جو حساسیت ہوتی ہے،اس پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

ثالثی کا عمل کیا ہے؟

ثالثی کا عمل ایک تیسرے فریق کی کوشش ہوتی ہے جس کا مقصد اختلاف کرنے والے فریقین کے تنازعات کو ان کے اطمینان کے مطابق حل کرنے کی کرنا ہوتا ہے۔ یہ ثالثی کی معیاری تعریف ہے،اور یہ ایک ایسا عمل ہے جو پوری دنیا میں خاندانوں اور برادریوں میں ہمیشہ سے چلتا آیا ہے۔ یہ ایک قدیم طریق کار ہے جو دنیا بھر میں تمام کمیونٹیز میں پایا جاتا ہے۔ ہماری کمیونٹیز کے اندر، کچھ ایسے افراد موجود ہوتے ہیں جو ثالث کا کردار ادا کرتے ہیں، یہ مذہبی رہنما بھی ہو سکتے ہیں اور سیکولر بھی۔

اقوام متحدہ کی تنظیم ایک خاص قسم کی ثالثی میں مہارت رکھتی ہے، جسے انتہائی حساسیت کے حامل امور پر تنازعہ کی ثالثی کہا جاتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد، اقوام متحدہ نے بہت سے مقاصد کو لے کر جنم لیا، جن میں سے ایک دوسری جنگ کو روکنا تھا۔اس

طرح یہ تنظیم ثالثی اور امن کو بہت سنجیدگی سے لیتی ہے۔اقوام متحدہ کیسے کام کرتی ہے، پہلے اس پر بات کر لیتے ہیں، اس کے بعد اقوام متحدہ کی ثالثی کی پانچ خصوصیات اور پھر پانچ چیلنجز کا ذکر کریں گے۔

زیادہ تر بڑے تنازعات میں، اقوام متحدہ یا تو مرکزی ثالث کے طور پر کام کرتی ہے، یا ثالث کے طور پر کام کرنے والی علاقائی اور مقامی تنظیموں کی حمایت کا حصہ ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر، بعض جگہوں پہ قیامِ امن میں کردار ادا کرنے والی مذہبی تنظیموں کی کوششوں کی حمایت کرتی ہے۔نائیجیریا میں 2011 کے صدارتی انتخابات میں خانہ جنگی شروع ہونے کا بہت خدشہ تھا، ان خدشات کی وجہ یہ تھی کہ جو بھی پارٹی انتخابات ہارے گی وہ نتائج کو مسترد کر دے گی۔ اگرچہ اقوام متحدہ وہاں پر مرکزی ثالث نہیں تھی، مگر اس نے وہاں کی مقامی سطح پر کام کرنے والے مسلم اور عیسائی رہنماؤں کے مذہبی ہم آہنگی کے تصور کی حمایت کی جو تمام سیاسی جماعتوں کو ضابطہ اخلاق کی پابندی کرنے پر زور دینے کے لیے متحد ہوئے تھے۔ یہ مثال ظاہر کرتی ہے کہ ثالثی کبھی کبھار رسمی طاقت کے استعمالی کی بجائے اخلاقی اتھارٹی کے ذریعے کیسے موثر ہو سکتی ہے۔

یمن، شام اور جنوبی سوڈان جیسی بڑی خانہ جنگیوں میں، اقوام متحدہ مرکزی ثالث کے طور پر کام کرتی ہے۔ثالثی کے عمل میں اس کے مقاصد جہاں تک ممکن ہو تشدد کو روکنا اور تنازعات کے حل میں سہولت فراہم کرنا ہوتا ہے۔

اقوام متحدہ کے ثالثی کے عمل کی خصوصیات اور چیلنجز کو بیان کیا جاتا ہے:

ثالثی کی خصوصیات

پہلی خصوصیت:

اقوام متحدہ کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے پاس ثالثی کا پیشہ ورانہ عزم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ثالث کو ثالثی کی سائنس اور فن دونوں سے اچھی طرح واقف اور اس حوالے سے تربیت یافتہ ہونا چاہیے۔ کچھ افراد ثالثی کے لیے فطری بصیرت رکھتے ہوتے ہیں، جبکہ ثالثی کا عمل ایک سائنس بھی ہے جس میں تنازعات کے حل کے لیے کچھ مؤثر تکنیکوں اور حکمت عملیوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ ہم ان طریقوں کو سکھا اور سیکھ سکتے ہیں۔ میں سوئٹزرلینڈ میں ہر سال منعقد ہونے والے اقوام متحدہ کے اعلیٰ سطحی ثالثی کورس کو چلاتا ہوں۔ یہ کورس یقینی بناتا ہے کہ اقوام متحدہ کے سینئر سفارت کار ثالثی کی سائنس میں تربیت یافتہ ہیں۔

دوسری خصوصیت:

دوسری خصوصیت گہرے تجزیے کے لیے پرعزم ہونا ہے۔ اقوام متحدہ میں پیشہ ور ثالث، ثالثی کے عمل میں جامع تجزیہ کرنے کی اہمیت پر زور دیتے ہیں۔ لاعلمی کو ثالثی کے اندر سب سے بڑی غلطی اور گناہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کام میں مداخلت سے پہلے تنازعہ میں شامل تمام فریقین کی تاریخ، حرکیات اور مفادات کو سمجھنے کی ضرورت کو اجاگر کیا جاتا ہے۔

تیسری خصوصیت:

تیسرا، غیر جانبداری کا عہد بہت ضروری ہے۔ اقوام متحدہ کے ثالث ارکان، تنظیم کی اقدار کو یقینی بناتے اور انہیں فروغ دیتے ہیں۔ وہ ان معاملات میں غیر جانبدار رہتے ہیں۔ غیر جانبداری میں تمام فریقوں کے ساتھ منصفانہ سلوک کرنا ہوتا ہے۔ چیلنجز کے باوجود، متحارب جماعتوں کے درمیان اعتماد پیدا کرنے کے لیے غیر جانبداری کو برقرار رکھنا ضروری ہے۔

چوتھی خصوصیت:

اقوام متحدہ کی ثالثی کی چوتھی خصوصیت، تنظیم کی اپنی اقدار کے ساتھ گہری وابستگی ہے۔ اقوام متحدہ کا چارٹر، انسانی حقوق کا عالمی اعلامیہ، اور اقوام متحدہ کی قرارداد 1325 جیسی قراردادیں، ثالثی کی کوششوں میں مؤثر رہنمائی کے لیے لازمی سمجھی جاتی ہیں جن کی رعایت رکھی جاتی ہے۔ ان اقدار کو صرف مغربی نہیں سمجھا جاتا، بلکہ تمام رکن ممالک انہیں قبول کرتے ہیں۔

پانچویں خصوصیت:

پانچویں خصوصیت کا مقصد نہ صرف تشدد کو ختم کرنا ہے بلکہ اس کے دوبارہ ہونے کو روکنا بھی ہے۔ مؤثر روک تھام میں بنیادی تنازعات کے ساختیاتی مسائل کو حل کرنا شامل ہے، جو اکثر معاشروں میں تشدد کی بنیادی وجہ ہوتے ہیں۔ ان مسائل سے نمٹ کر، ثالثی کی کوششیں پائیدار امن اور استحکام میں معاون سکتی ہیں۔

ثالثی میں درپیش چیلنجز

پہلا چیلنج:

ثالثی کے عمل میں بنیادی اور سب سے اہم چیلنج یہ ہے کہ سنگین تنازعات میں شامل فریقین اکثر ثالثی کے خلاف مزاحمت کرتے ہیں۔ وہ مذاکرات اور باہمی تعاون کے ذریعے حل تلاش کرنے کے بجائے ایک دوسرے کو شکست دینے کی خواہش رکھتے ہوتے ہیں۔ وہ ثالثی کو، فتح حاصل کرنے کے اپنے مقصد کی راہ میں رکاوٹ سمجھتے ہیں۔ ہم باہمی تعاون اور بقائے باہمی کا تصور دیتے ہیں، جسے وہ کلی طور پہ مسترد کرتے ہیں۔ ہمیں یہ تسلیم ہے کہ ہم بہ طور ایک عالمی تنظیم، کوئی دیوتا، جادوگر، یا فوجوں کی کمانڈ کرنے والے جرنیل نہیں ہیں۔ ہمارے پاس ہمیشہ اچھے نتائج پیدا کرنے کی طاقت نہیں ہوتی۔ ہم تنازعہ میں شامل فریقین کی رضامندی اور تعاون پر ہی انحصار کرتے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے، وہ یہ چیز فراہم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ فریقین کی اسی سخت ذہنیت کی وجہ سے تنازعات برسوں تک برقرار رہ سکتے ہیں، جہاں ایک فریق سمجھتا ہے کہ اس کا فائدہ ہی دوسرے کا نقصان ہے۔ یہ ذہنیت باہمی تعاون میں رکاوٹ بنتی ہے اور تنازعات کے گھن چکر کو برقرار رکھتی ہے۔

دوسرا چیلنج:

دوسرا چیلنج، متحارب فریقین کی طرف سے ثالثی میں شامل ہونے میں ہچکچاہٹ سے پیدا ہوتا ہے۔ ایسی صورتحال میں، ہمیں اس کا حصہ بننے پر مجبور کرنے کے لیے دباؤ ڈالنا چاہیے۔ تاہم، پابندیاں عائد کرنا، جیسے کہ بین الاقوامی فوجداری عدالت کے ذریعے کیا

جاتا ہے یا ہتھیاروں کی پابندی، وغیرہ بعض اوقات الٹا اثر بھی ڈال سکتے ہیں۔اس کے بعد تعاون کرنے کے بجائے،اس بات کا امکان ہوتا ہے کہ یہ چیز فریقین کو ان کے عہدوں پر مزید مضبوط کر سکتی ہے، جس سے وہ اقوام متحدہ کی مداخلت کے خلاف زیادہ مزاحم بن سکتے ہیں۔ کئی تنازعات میں ایسیف مثالیں بھی موجود ہیں۔

تیسرا چیلنج:

اقوام متحدہ کی ثالثی میں تیسرا اہم چیلنج سلامتی کونسل میں دنیا کی بڑی طاقتوں کی سیاست اور اثر و رسوخ میں غیر جانبداری کو برقرار رکھنا ہوتا ہے۔ امریکہ، برطانیہ، فرانس، روس اور چین سمیت بڑی طاقتوں پر مشتمل، سلامتی کونسل کو ایسے تنازعات میں ثالثی کرتے وقت مشکلات پیش آتی ہیں جن میں ایسا کوئی بڑا فریق بھی شامل ہو جس نے کوئی سخت اقدامات کیے ہوئے ہوں۔ تمام فریقوں کے ساتھ انصاف پر مبنی توازن قائم رکھنا جذباتی، نفسیاتی اور اخلاقی طور پر ایک چیلنجنگ کام ہے۔ بہر حال، ایسے پیچیدہ حالات میں بھی، مؤثر ثالثی کے لیے اعتماد کو برقرار رکھنا بہت ضروری ہے۔

چوتھا چیلنج:

چوتھا اہم چیلنج تنازعہ کے فریقوں کی مختلف ترجیحات سے پیدا ہوتا ہے۔ اگرچہ امن کی بڑے پیمانے پر قدر کی جاتی ہے اور جنگ کو بدترین صورت حال سمجھا جاتا ہے، لیکن تمام گروہ انصاف کے مقابلے میں امن کو زیادہ ترجیح نہیں دیتے۔ نسل پرستی کے دور میں افریقی نیشنل کانگریس کے سابق رکن کے طور پر، میں ذاتی طور پر سمجھتا تھا کہ انصاف

امن سے زیادہ اہم ہے۔ تاہم، اقوام متحدہ اکثر انصاف کے مقابلے میں امن کو ترجیح دیتی ہے، جس سے ثالثی کی کوششوں کو چیلنج لاحق ہوتا ہے۔

ایک اور چیلنج اقوام متحدہ کے آفاقی اقدار سے وابستگی کے دعوے کے ساتھ جڑا ہے۔ ظاہری تاثر یہ ہے کہ ان میں بنیادی طور پر مغربی لبرل اقدار کی عکاسی ہوتی ہے۔ ثقافتی غیر جانبداری کا دعویٰ کرنے کے باوجود، یہ ادارہ اکثر مشرقی اور چینی ثقافتوں کے تناظر کو نظر انداز کرتے ہوئے مغربی ایجنڈے کو فروغ دیتا ہے۔ مقامی تنازعات میں شامل جماعتوں کی مذہبی، نسلی اور ثقافتی اقدار پر غور کرنے میں لچک کی کمی موثر ثالثی کی راہ میں ایک اہم رکاوٹ ہے۔ ان چیلنجز کے باوجود، اقوام متحدہ مثبت صفات کا حامل ادارہ ہے اور ثالثی کے عمل میں سمجھوتے کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے۔ تاہم، سمجھوتہ بعض اوقات انصاف کی راہ میں رکاوٹ بن سکتا ہے۔ خاص طور پر جب اشرافیہ کے قضیے سامنے ہوتے ہیں، تو عام لوگوں، خاص طور پر محنت کش طبقے کے خدشات کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ متحارب فریق اکثر اپنا اثر و رسوخ استعمال کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے میں ثالث کو ایک مخمصے کا سامنا ہوتا ہے۔

سوالات وجوابات

سوال : پاکستان کو سیاسی عدم استحکام کا سامنا ہے۔ کیا آپ کو لگتا ہے کہ اقوام متحدہ پاکستان کو مستحکم کرنے میں کوئی کردار ادا کر سکتا ہے؟

جواب : مستقبل قریب میں نہیں۔ اقوام متحدہ کے بنیادی اصولوں میں سے ایک ملکی معاملات میں عدم مداخلت ہے جسے خود مختاری کے اصول کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ اصول بین الاقوامی نظام کی سب سے نمایاں خصوصیات میں سے ایک ہے، اور اقوام متحدہ سب قوموں کی خود مختاری کا احترام کرتی ہے۔ بد قسمتی سے، مداخلت کا مطلب یہ ہے کہ اقوام متحدہ کو اس پر غور کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ حالات کافی خراب ہونے چاہیئں۔ دوسرے لفظوں میں، اقوام متحدہ کی مداخلت تب ہوتی ہے اگر بڑی تعداد میں لوگ مر رہے ہوں۔ میں 2005 سے 2006 تک سوڈان میں دارفر کے لیے اقوام متحدہ کی افریقی یونین کی ثالثی میں شامل تھا۔ اس مداخلت کا سبب یہ تھا کہ وہاں 300,000 لوگ مارے گئے تھے، اور وہاں نسلی تطہیر اور نسل کشی ہوئی تھی۔ تنازعات کی ایسی انتہائی صورتوں میں، اقوام متحدہ مداخلت کرتی ہے۔ خود مختاری کے خدشات سے بھی قطع نظر، پاکستان کی موجودہ صورتحال یا میرے اپنے ملک جنوبی افریقہ یا حتیٰ کہ امریکہ جیسے سیاسی بحرانوں میں، اقوام متحدہ مداخلت نہیں کرتی۔ رکن ممالک عام طور پر اپنے ملکی بحرانوں میں بین الاقوامی مداخلت نہیں چاہتے۔ خلاصہ یہ کہ، اقوام متحدہ مداخلت پر اس وقت غور کرتی ہے جب صورت حال نمایاں طور پر خراب ہو، جس میں ممکنہ طور پر جانی نقصان بھی شامل ہے۔

سوال: ہم آج دنیا میں مشاہدہ کرتے ہیں کہ ایک فریق کے ساتھ ہونے والی ناانصافی کو دوسرے فریق سے مختلف کہا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر، فلسطین اور اسرائیل کے معاملے میں، اسرائیلی اکثر اسے زینوفوبیا کہتے ہیں، جب کہ فلسطینیوں کو زبردستی ان کے گھروں سے نکالا جارہا ہے۔ آپ نے بتایا کہ اقوام متحدہ یوکرین اور روس یا شام اور امریکہ جیسوں کے مسائل میں مداخلت کا ارادہ نہیں رکھتا، لیکن کیا اقوام متحدہ فلسطین اور اسرائیل کے درمیان کسی قسم کی ثالثی کا منصوبہ بنارہا ہے؟

جواب :اسرائیل اور فلسطین کے درمیان حالات اس بات کی گواہی ہیں کہ کس طرح اقوام متحدہ کو بڑی طاقتوں کی سیاست، خاص طور پر امریکی پوزیشن کی وجہ سے رکاوٹ کا سامنا ہے۔ اقوام متحدہ باضابطہ طور پر یورپی یونین، امریکہ اور روس کے ساتھ اتحاد کا حصہ ہے، جسے Quartet کہا جاتا ہے، جو مشرق وسطیٰ کے امن عمل کے لیے ذمہ دار ہے۔ تاہم، حقیقت میں، اس امن عمل پر امریکہ کا غلبہ ہے، جو اسے اپنا ذاتی مسئلہ سمجھتا ہے۔ اسرائیل کے ساتھ امریکہ کے مضبوط اتحاد کے سبب، وہ اسرائیل پر کوئی خاص دباؤ ڈالنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ یہ چیز واضح کرتی ہے کہ کس طرح امریکہ مؤثر طریقے سے اقوام متحدہ کو اس عمل سے دور رکھتا ہے۔ اقوام متحدہ کے پاس اپنے رکن ممالک سے زیادہ طاقت نہیں ہے۔ یہ تنظیم، رکن ممالک کا مجموعہ ہے، جس میں سب سے زیادہ طاقتور ممبران سب سے زیادہ اثر ورسوخ استعمال کرتے ہیں۔ اگرچہ میں نے کشمیر کے سوال پر براہ راست توجہ نہیں دی، لیکن یہی اطلاق اس پر بھی ہوتا ہے۔ اگر ہندوستان نہیں چاہتا کہ اقوام متحدہ کشمیر میں مداخلت کرے، اور اس کے موقف کو امریکہ کی حمایت بھی حاصل ہو، تو اقوام متحدہ کی مداخلت کا امکان نہیں ہے۔ اگرچہ ہم اقوام متحدہ

کوایک خیر خواہ اور عالمگیر تنظیم کے طور پر دیکھتے ہیں، لیکن یہ تسلیم کرنا بھی ضروری ہے کہ اس کے اجزاء بڑی طاقتوں کی سیاست کے تناظر میں کام کرتے ہیں۔ اگرچہ یونیسیف جیسے ادارے انسانیت کی ترقی کے لیے پر عزم ہیں، لیکن بہر حال سلامتی کونسل اپنے طاقتور ترین اراکین کی سیاست سے متاثر ہوتی ہے۔

سوال :اقوام متحدہ کا ایک اصول یہ ہے کہ وہ ملکی مسائل میں مداخلت نہیں کرے گا۔ تاہم، حالیہ رپورٹس بتاتی ہیں کہ کئی ملکوں میں انٹرنیٹ، سیلولر کنکشن اور میڈیا کو بند کرنے جیسی انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں ہوتی ہیں۔ ملکی معاملات میں براہ راست مداخلت نہ کرنے کی پالیسی کے باوجود، کیا اقوام متحدہ ان رپورٹ شدہ خلاف ورزیوں کو حل کرنے کا منصوبہ بنا رہا ہے؟

جواب :خود مختاری اور عدم مداخلت کے اصول کا مقصد کمزور ریاستوں کو مضبوط ریاستوں سے بچانا ہے۔ اس کا دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ بہت سے امور میں ریاستوں کے پاس اپنے شہریوں کے ساتھ زیادتی کرنے کا موقع ہوتا ہے، کیونکہ اقوام متحدہ ہر جگہ مداخلت نہیں کرتی۔ جب ریاستیں اپنے شہریوں کی حفاظت کرنے میں ناکام رہتی ہیں، تو پھر بین الاقوامی برادری کو مداخلت کرنی پڑتی ہے۔ تاہم، یہ بھی ضروری نہیں کہ یہ اصول ہر جگہ صحیح کام کر جائے، جیسے کہ لیبیا میں حکومت کی تبدیلی اور اس کے بعد مسائل نے اقوام متحدہ کو محتاط کر دیا ہے۔ آپ کے سوال کے تناظر میں، اقوام متحدہ کی مداخلت یا یہاں تک کہ کوئی بیان جاری کرنے کا امکان نہیں ہے جب تک کہ بین الاقوامی سیاست کی پیچیدگیوں کی وجہ سے صورتحال میں اہم اور وسیع پیمانے پر انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں شامل نہ ہوں۔

سوال : کیا اقوام متحدہ کا امن مشن صرف تنازعات کے حل اور تشدد کی روک تھام پر مرکوز ہے، یا یہ دوسرے انسانی بحرانوں کو بھی حل کرتا ہے؟

جواب :امن قائم کرنا ایسے حالات میں ہوتا ہے جہاں امن موجود نہ ہو، اور متضاد فریق ابھی تک لڑائی میں مصروف ہوں۔ اقوام متحدہ ایسے تنازعات کو حل کرنے میں مدد کے لیے ثالث تعینات کرتا ہے۔ تاہم، ثالثی میں کامیابی حاصل کرنا مشکل کام بھی ہے کیونکہ اس کے لیے تمام متعلقہ فریقوں کی رضامندی درکار ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر، دارفور میں، افریقی یونین (2006-2005) اور مشترکہ AU-UN مشن -2010) (2011دونوں کو چیلنجز کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ سوڈانی حکومت کی جانب سے ہماری شمولیت پر اعتراضات تھے۔ گھریلو تنازعات میں، اگر ثالثی کی کوششیں ناکام ہو جاتی ہیں، تو قانون نافذ کرنے والے ادارے مداخلت کر سکتے ہیں۔ بین الاقوامی تنازعات میں، جیسے کوسوو اور سربیا کے درمیان، اکثر پیچیدہ اور طویل ثالثی کی کوششوں کی ضرورت ہوتی ہے جس میں یورپی یونین جیسے ادارے شامل ہوتے ہیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ، یہ بحث صرف اور صرف اقوام متحدہ کی ثالثی کی کوششوں پر مرکوز ہے اور اس میں دیگر خصوصی ایجنسیوں کو موضوع نہیں بنایا گیا ہے۔

سوال : کیا یہ سچ ہے کہ اقوام متحدہ کو بعض اوقات سپر پاور کے کسی موقف کو آگے بڑھانے کے لیے ایک آلے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے؟

جواب :بہت سی صورتوں میں جواب ہے کہ، ہاں۔ لیکن ایسا ہمیشہ نہیں ہوتا۔ اقوام متحدہ کو بڑی طاقتوں کی طرف سے بعض ایسے تنازعات میں ایک آلے کے طور پر

استعمال کیا جاسکتا ہے جہاں ان طاقتوں کے مفادات ہم آہنگ ہوں۔ تاہم، کچھ افریقی تنازعات میں، بڑی طاقتیں اقوام متحدہ کی کارروائیوں میں رکاوٹ نہیں ڈالتی ہیں، اور اسے غیر جانبداری سے اپنا کام کرنے کی اجازت دیتی ہیں۔ مشرق وسطیٰ میں، صورت حال زیادہ پیچیدہ ہے، کیونکہ امریکہ اور روس دونوں ہی خطے کو جغرافیائی سیاسی مسابقت اور اقتصادی مسابقت کے میدان کے طور پر دیکھتے ہیں، جس سے اقوام متحدہ کا اثر محدود ہو جاتا ہے۔ یہ ہر جگہ کے اعتبار سے اور مخصوص خطوں اور تنازعات کی حرکیات پر منحصر ہوتا ہے۔ مزید برآں، ایسے تنازعات کہ جن میں روس یا امریکہ جیسی بڑی طاقتوں کی براہ راست یا بالواسطہ شمولیت ہوتی ہے، ان میں P5 ممبران کے پاس ویٹو پاور کی وجہ سے اقوام متحدہ کو اکثر رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اقوام متحدہ کو بعض اوقات بڑی طاقتوں کے ذریعہ ایک آلے کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے، مگر کئی حوالوں سے یہ ادارہ آزادانہ طور پر بھی کام کرتا ہے۔

عالم اسلام میں جمہوریت کے مختلف مظاہر اور ان کی اساسات

ڈاکٹر قبلہ ایاز

ڈاکٹر قبلہ ایاز پاکستان کے علمی حلقے کا ایک نمایاں نام ہیں، اور اس وقت اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین کے طور پہ ذمہ داریاں ادا کر رہے ہیں۔ زیرنظر مضمون میں انہوں نے اس جانب روشنی ڈالی ہے کہ مسلم دنیا میں پائے جانے والے مختلف سیاسی نظام کیا ہیں اور وہ کن تاریخی و فکری بنیادوں پر قائم ہیں۔ مضمون میں اس پر بھی گفتگو کی گئی ہے کہ پاکستان میں اور مسلم دنیا کے بعض ممالک میں جمہوریت کی ناکامی کے اسباب کیا ہیں۔

عصر حاضر کی مسلم سیاسی فکر میں جن موضوعات کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے ان میں سے ایک 'اسلام اور جمہوریت' کا مسئلہ ہے، کہ جمہوریت کے بارے میں مذہبی نقطہ نظر کیا ہے، یہ نظم مسلم معاشروں کے لیے سود مند ثابت ہو سکتا ہے یا نہیں، مزید برآں اس کا تعلق تہذیبی و ثقافتی کشمکش سے ہے یا یہ محض ریاستی انصرام کا جدید نمونہ ہے۔ نظری اعتبار سے جمہوریت کے متعلق مسلم سماج میں اس حد تک غیر شفافیت پائی جاتی ہے کہ علمی حلقوں میں یہ بحث ابھی تک جاری ہے اور عام لوگ اب بھی اسے شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس کے بارے میں ابہام کا شکار ہیں۔

میرے خیال میں جمہوریت کے بارے میں بدگمانی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مسلم معاشروں میں حقیقی جمہوریت اپنی معیاری اقدار کے ساتھ متعارف نہیں ہو سکی۔ لیکن ان کے سیاسی ڈھانچے چونکہ ظاہری طور پہ جمہوری کہلاتے ہیں اس لیے گورننس کے مقامی مسائل، مالی بدعنوانی، ناانصافی اور عدم مساوات جیسی برائیوں کو جمہوری نظم کی دین خیال کر لیا جاتا ہے۔ یہ تصور پروان چڑھا کہ جمہوریت اپنے اندر ایسے خلار کھتی ہے جس کی بنیاد پر یہ تمام سماجی مسائل جنم لیتے ہیں، اس لیے یہ نظام درست نہیں ہے۔ حالانکہ یہ جمہوریت کی ناکامی نہیں ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ جمہوری اصولوں کی پاسداری نہیں کی جاتی۔ جمہوریت صرف انتخابات کے انعقاد کا نام نہیں ہے بلکہ اس کی بہت اہم اقدار ہیں جن پر اس کا ڈھانچہ استوار ہوتا ہے۔ اس میں بدعنوانی، ناانصافی اور میرٹ کے خلاف کام کرنے کی اجازت نہیں ہوتی اور نہ ہی اس نظام کا یہ تقاضا ہے کہ ادارے رُوبہ انحطاط ہوں۔ جمہوریت درحقیقت شفافیت کو یقینی بنانے کا مطالبہ کرتی ہے۔

پاکستان میں جمہوریت کی ناکامی کے اسباب

پاکستان آئینی اعتبار سے ایک جمہوری ملک ہے۔ دستور میں ان تمام اصولوں واقدار کے تحفظ کی بات کی گئی ہے جن پر ایک جمہوری نظام قائم ہوتا ہے۔ اس لیے پاکستان بننے سے اب تک سماجی مسائل کے حل کے لیے جتنی بھی دشواریاں اور مسائل درپیش آتے رہے، ان کا سبب یہ خیال کر لیا جاتا ہے کہ جمہوریت اس کی ذمہ دار ہے۔ لیکن غیر جانبدارانہ اور گہرائی سے کیا جانے والا تجزیہ یہ بتاتا ہے کہ پاکستان اگرچہ آئینی طور پہ

ایک جمہوری ملک ہے، لیکن یہاں جمہوری عمل نہایت کمزور رہا ہے۔ پاکستان میں جمہوری عمل کے کمزور ہونے کی تین بنیادی وجوہات ہیں:

۱۔ ہمارے ملک میں باصلاحیت افراد کا انتخاب نہیں ہو پاتا یا انتخابی طریقِ کار میں سقم پائے جائے جاتے ہیں۔

۲۔ پارلیمان کے کردار کو اہمیت نہیں دی جاتی یا اس ادارے کا درست استعمال نہیں کیا جاتا۔ اس کی ایک مثال یہ ہے گزشتہ حکومت کے دوران ایک بِل پاس کیا گیا تھا جس کے مندرجات سے لوگوں کو یہ شک گزرا کہ شاید اس کے تحت ایک غیر مسلم طبقے کو مسلمان قرار دیا جارہا ہے۔ جس کے بعد ایک نئی جماعت وجود میں آگئی اور شدید مسائل پیدا ہوئے جن کا تسلسل ابھی تک جاری ہے۔ اس بِل کو پارلیمان کی سٹینڈنگ کمیٹی میں پیش نہیں کیا گیا تھا، نہ متعلقہ ماہرین کی رائے لی گئی تھی۔ ملک میں جب بھی پارلیمانی عمل کو غیر اہم سمجھ کر نظرانداز کرنے کی کوشش کی گئی اس سے بحران نے جنم لیا۔

پاکستان دنیا کے ان معدودے چند جمہوری ممالک میں سے ایک ہے جہاں ایگزیکٹو حکم نامے کے ذریعے قانون کی منظوری کا اختیار دیا گیا ہے۔ حقیقی جمہوریتوں میں قانون کی منظوری کا استحقاق پارلیمنٹ کی مجلس قانون ساز کو حاصل ہوتا ہے لیکن پاکستان اور کچھ دیگر ممالک میں آئینی طور پہ یہ اختیار ایگزیکٹو اتھارٹی کو بھی دیا گیا ہے کہ وہ اسے بغیر بحث ومباحثے کے منظور کرلے۔ پاکستان کے آئین کے آرٹیکل 89 میں درج ہے کہ ''جب سینٹ اور قومی اسمبلی کا اجلاس جاری نہ ہو اور حالات ایسے ہوں کہ متعلقہ معاملے

میں فوری اقدام درکار ہو تو ایسی صورتحال میں صدر کو یہ اختیار ہے کہ وہ آرڈیننس تیار کرکے اس کا اجراء کردے"۔ بادی النظر میں آئین اس استثنا کی اجازت صرف غیر معمولی صورتحال میں فراہم کرتا ہے، جب پارلیمنٹ کا اجلاس جاری نہ ہو اور نہ نزدیکی تاریخ میں اسے طلب کیا جاسکتا ہو، اور قانون ایسی فوری اہمیت کا حامل ہو کہ اسے پارلیمنٹ کے آئندہ اجلاس تک مؤخر نہ کیا جاسکتا ہو۔ تاہم اگر 1973ء کے آئین کی تشکیل سے اب تک جتنے بھی آرڈیننس منظور کیے گئے ہیں اگر ان کے اجراء کے حالات کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں سے کوئی ایک بھی بمشکل ایسا ہوگا جس کے لیے پارلیمنٹ کے اجلاس کا انتظار نہ کیا جاسکتا تھا۔

۳۔ پاکستان میں جمہوریت کی ناکامی کی تیسری وجہ انتقالِ اقتدار کے مرحلے کو صحت منداور شفاف انداز میں آگے نہ بڑھانا ہے۔

ریاستی نظم کے حوالے سے ان تین امور کو بہت اساسی درجہ حاصل ہے۔ ان کی پاس داری کرنا ہر جمہوری ریاست میں ضروری ہوتا ہے۔ جمہوریت اپنے ثمرات تب دیتی ہے جب اس کے اصولوں کا پاس رکھا جائے۔ ہم اس نظام کے ساتھ انسلاک میں مذکورہ بالا تین امور میں سے کسی نہ کسی امر میں غلطی کا ارتکاب کرتے رہتے ہیں جس کے سبب معاشرتی اور معاشی بحران پے درپے چلے آتے ہیں۔ پاکستان کی بہتّر سالہ تاریخ آئینی تاریخ ہے جس کی فکری بنیاد جمہوریت ہے۔ جمہوریت صرف اقدار و مزاج کا نام ہی نہیں یہ ایک ڈھانچہ، لائحہ عمل اور طریقہ کار کا نام بھی ہے۔ یہ طرز حکمرانی ہے جو نچلی سطح سے بالائی سطح تک باقاعدہ عملی شکل اختیار کرتی ہے۔

عالمِ اسلام میں جمہوریت کی مختلف شکلیں

مسلم دُنیا کے بیشتر ممالک استعماری قوتوں کے ماتحت رہ چکے ہیں۔ استعمار اپنے رویے کے اعتبار سے استحصالی نوعیت کا حامل ہوتا ہے۔ البتہ تقابلی جائزے میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس کی مختلف شکلیں ہیں جن کے اثرات مسلم دنیا میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ سترھویں واٹھارویں صدی کے دوران یورپ استعماری قوتوں کا مرکز سمجھا جاتا رہا ہے۔ اس کے تین ملک بالخصوص زیادہ فعال اور نمایاں رہے ہیں۔ برطانیہ، فرانس اور پرتگال۔

برطانوی استعمار کی خصوصیت یہ رہی ہے کہ یہ جدھر بھی گیا وہاں اس نے جہاں ایک طرف مالی مفادات سمیٹے وہیں اس کے ساتھ کچھ اچھے کام بھی کیے۔ مثال کے طور پہ ریل گاڑیوں کے جال بچھائے، سڑکیں بنائیں، مقامی قومی زبانوں کو فروغ دیا اور ان کے قواعد ترتیب دیے، صحت کے جدید ادارے بنائے، تعلیمی اداروں کی کی بنیاد رکھی۔ اس طرح کے کاموں سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ لوگ جمہوریت سے واقف ہوئے، تعلیم حاصل کی اور استعمار کو باہر نکالنے میں ان تعلیمی اداروں سے پڑھے ہوئے لوگ صف اول کے قائدین بھی بنے۔

جبکہ فرنچ استعمار کی خصوصیت یہ رہی ہے کہ اس نے ماتحت ممالک پر پابندیاں عائد کیں۔ تعلیمی و تعمیری سرگرمیوں کو آزاد نہیں کیا اور عوام کو ترقی کے جوہر سے مانوس یا واقف نہیں ہونے دیا۔

پرتگالی استعمار کا نمایاں مظہر یہ تھا کہ اس نے مذہب کو مقدم رکھا۔ جہاں بھی گیا مسیحیت کو فروغ دیا اور مذہبی سرگرمیوں میں تیزی لائی۔

ان تینوں استعماری قوتوں کے زیر نگین رہنے والے ممالک میں ان کی خصوصیات کے عملی مظاہر آسانی کے ساتھ محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ برطانوی زیر نگین ممالک میں ایک گونہ جمہوری نظام کچھ زیادہ نمایاں ہے۔ اگرچہ یہ سیاسی اعتبار سے آزاد اور مکمل فعال نہیں ہے لیکن جمہوری سوچ موجود ہے۔ اس کی مثال برصغیر ہے۔ نائیجیریا اور نائجر دو ہمسائے ممالک ہیں۔ نائجر میں فرانس قابض رہا ہے، وہاں لوگ ترقی کے بنیادی مظاہر سے ابھی واقفیت حاصل کر رہے ہیں، ابھی سڑکیں تعمیر ہو رہی ہیں۔ جبکہ نائجیریا اس کی بہ نسبت کافی بہتر اور خوشحال ہے۔ ایسے علاقے جہاں پرتگالی گئے وہاں مسیحیت کو فروغ ملا۔ بھارت کے ساحلی علاقے گوا میں مسیحیت کی ترویج پرتگالیوں نے کی تھی۔ افریقہ کا ملک مالی اب تک بحران کی صورتحال سے گزر رہا ہے۔ اس کے ایک حصے پر القاعدہ نے قبضہ کر لیا تھا جسے فرانسیسی فوج کی مدد سے واپس لیا گیا لیکن ابھی بھی وہاں سیاسی ابتری غالب ہے۔ گیمبیا ایک چھوٹا سا مسلمان ملک ہے، او آئی سی کے ایک سابق صدر اس سے تعلق رکھتے تھے، وہاں بھی حالات شدید دگرگوں ہیں۔

ملائشیا آہستہ آہستہ جمہوریت کی جانب رواں دواں ملک ہے۔ اس ملک میں خوشحالی اور ترقی کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ سابق صدر مہاتیر محمد کا ایک نقطہ نظر تھا، ان کے مطابق ترقی کے لیے سیاسی استحکام کی بہت ضروری ہوتی ہے جس کے لیے حکومت کو زیادہ وقت دینا ناگزیر ہوتا ہے۔ یوں وہ زیادہ دیر حکومت میں رہے لیکن ان کی قیادت میں ملائشیا نے ترقی کی طرف واضح پیش قدمی کی۔

ایک اور مسلمان ملک کا نظام بھی قابل توجہ ہے۔ اسے دنیا میں ایک بہترین نظیر کے طور پہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ عرب ملک تیونس میں راشد الغنوشی نے ایک ممتاز اسلامی جمہوری نظام متعارف کرایا۔ انہوں نے اپنی اوائل سیاسی زندگی القاعدہ اور اخوان کے قریب گزاری اور وہ ان سے متاثر رہے ہیں۔ پھر انہوں نے اس سے رجوع کرتے ہوئے کہا کہ ہم جمہوریت کو ماڈل بناتے ہیں اور مذہب کو سیاسی عمل سے ایک حد تک فاصلے پر رکھتے ہیں۔ انہوں نے یہ ماڈل متعارف کرایا، جو کافی مقبول ہوا اور ابتدائی طور پہ کامیاب بھی ثابت ہوا اور اس ماڈل کی ساری دنیا میں پذیرائی ہوئی۔ لیکن حال ہی میں وہاں سیاسی تبدیلی آئی ہے اور راشد الغنوشی کی جماعت النہضہ کو شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ یہ نیا ماڈل ابتدائی عمل میں کامیاب تو ثابت ہوا کہ اس نے سیاسی استحکام دکھایا لیکن یہ انجام کار ترقی و خوشحالی کو نہیں لا سکا۔ تیونس کے صدر قیس سعید نے پارلیمنٹ کو توڑا تو اس کی سول سوسائٹی نے تو مذمت کی کہ یہ جمہوری رویہ نہیں لیکن اکثریت عوام نے اس کا خیر مقدم کیا۔

ایک اور مثال ہمارے پڑوسی ملک افغانستان کی ہے جہاں حال ہی میں ایک سیاسی تبدیلی آئی ہے۔ اس کے بارے میں فوری طور پہ کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ کیا یہ تبدیلی طاقت کے زور پہ آئی ہے؟۔ وقت ثابت کرے گا کہ یہ پہلو درست ہے یا غلط۔ البتہ کچھ اور ایسے اشارے ہیں جن سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ تبدیلی محض طاقت کے بل بوتے پر نہیں آئی ہے۔ 2011ء سے مذاکراتی عمل جاری تھا۔ اس دس سالہ طویل مذاکرات کے نتیجے میں بجا طور پہ کچھ چیزوں پر باہمی افہام و تفہیم کی گئی ہو گی جو واضح تو نہیں ہیں لیکن ان کے آثار موجود ہیں۔

پاکستان میں جمہوریت بلاشبہ کمزور ہے۔ جمہوری عمل اور جمہوری رویے مضبوط نہیں ہیں، لیکن یہاں مباحثہ ممکن ہے، جو ہوتا بھی رہتا ہے۔ بہتری کی گنجائش موجود ہے۔ تنقید کی جاسکتی ہے۔ یہ عوامل وآثار بتاتے ہیں کہ جمہوریت اگرچہ کمزور ہے لیکن یہاں اس کے راستے مکمل طور پہ مسدود نہیں ہیں۔ یہاں ادارے جیسے تیسے کام کر رہے ہیں۔ اس کی ایک مثال اسلامی نظریاتی کونسل ہے کہ جس سے متعلقہ معاملات میں مشاورت کی جاتی ہے اور رائے طلب کی جاتی ہے۔ اس کی افادیت و کردار کو بالائے طاق نہیں رکھا جاتا۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہے اور بہتری کے لیے کوششیں کی جاتی رہیں تو مستقبل میں جمہوری رویوں کو پنپتا بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

جمہوری رویے ترقی کی ضمانت

حقیقی جمہوری نظام میں ترقی اور خوشحالی اپنے راستے خود بناتی ہے۔ جب معاشروں میں خوف وقدغن کے سائے نہ ہوں اور سوچنے کے عمل کو آزاد رکھا جائے تو صلاحیتیں پروان چڑھتی ہیں۔ زندگی کے ہر شعبے میں نمو کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ ترقی کے پیراڈائم کو محصور نہیں رکھا جاسکتا۔ جمہوری رویے علم کی افزائش وحوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ سوسائٹی جو کہ اس میں بسنے والے تمام افراد کا مجموعہ ہوتی ہے یہ اپنی ساخت میں کثیر الجہتی ہوتی ہے، کیونکہ اس کے ممبر افراد میں ترجیحات اور قابلیتوں کی بنیاد پر تنوع پایا جاتا ہے۔ سیاسی نظام اگر ان قابلیتوں وصلاحیتوں کو راستہ نہیں دے گا تو ترقی کی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔ وہ معاشرے جن میں صنعتی انقلاب برپا ہو، فکر نہ صرف آزاد ہو بلکہ اپنے عصر کو سمجھ سکے اور اس کی ترقی میں اور سائنس و ٹکنالوجی کی افزائش میں اپنا

کردار ادا کرے وہاں سیاسی، معاشی اور سماجی ترقی ناگزیر ہے۔ جہاں جمہوری رویے مضبوط و مستحکم نہ ہوں وہاں کسی بھی قسم کی ترقی اپنی مستحکم بنیادوں سے محروم رہتی ہے۔ ہمارے ہاں ایسی اقدار کے نہ پنپ سکنے کے دو اسباب ہیں:

۱۔ ہم زرعی اور صنعتی معاشرے کے بیچوں بیچ لٹکے کھڑے ہیں۔ ہماری سیاسی اقدار جہاں ایک طرف زرعی معاشرے کے فرد کی آرزوؤں کا مکمل اظہار نہیں رہیں وہیں یہ جدید معاشرے کی ضرورتوں کو سمجھنے میں بھی ناکام ہیں۔

۲۔ ہم سیاسی رویوں کے اعتبار سے اس طور تنزلی کا شکار ہیں کہ معاشرے کی مقصدیت اور معاشرتی اقدار کی اہمیت کو نہ سمجھ رہے ہیں اور نہ ہی فکری طور پہ اس کے لیے فکری طور پر قائل ہوتے ہیں۔

جمہوری نظام میں علم کی افزائش تخلیقی بنیادوں پر ہوتی ہے۔ لوگ سیکھنے کے نئے نئے طریقے ایجاد کرتے ہیں۔ علمی سرگرمیوں کو آسان اور فعال بناتے ہیں۔ اس طرح خود بخود ایک ایسی روایت چل پڑتی ہے جس کے تحت انفرادی و سماجی زندگیوں میں بھی خوشحالی کے اثرات نظر آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ علم کی افزائش کا خصوصی مظہر یہ ہوتا ہے کہ سکھانے والا اور سیکھنے والا دونوں علمی و تخلیقی سرگرمیوں میں برابر کے شریک ہوں۔ یہ نہیں کہ صرف اساتذہ پڑھائیں اور شاگرد سنتے رہیں اور یاد کریں۔ علمی جمود ترقی کا راستہ مسدود کر دیتا ہے۔

مسلم معاشروں میں ظاہری جمہوری ڈھانچے تو موجود ہیں لیکن جمہوری عمل اور جمہوری رویے کمزور رہے ہیں اس لیے عوام کا اعتبار اس نظام سے کم ہو گیا ہے۔ عوام جمہوریت

کی اس لیے حمایت کرتے ہیں کہ ان کی ضرورتوں، حقوق، عزت نفس اور سماجی زندگی میں سہولیات کے حصول کا یہی واحد راستہ ہے۔ اور صرف جمہوریت ہی وہ راستہ ہے کہ جس میں ووٹرز سیاسی جماعتوں کو مجبور کرتے ہیں کہ ان کے اقتدار کی آرزو صرف اس صورت میں پایا تکمیل تک پہنچ سکتی ہے، جب وہ وہی منشور لائیں جو ان کی ضرورتوں کا پورا پورا عکس ہو۔ ووٹرز جمہوریت کو سیاسی جماعتوں کو اقتدار میں لانے کی خاطر پسند نہیں کرتے بلکہ اپنے مفادات کی جستجو میں ایسا کرتے ہیں، یہ بات انتہائی اہم ہے۔ لیکن جب انتخابات تو ہوں لیکن جمہوری عمل کام نہ کرے تو جمہوریت پر سوال اٹھنے شروع ہو جاتے ہیں، حالانکہ اصل سوال جمہوری رویوں پر اٹھتا ہے جو ترقی و خوشحالی کی اصل ضمانت ہیں۔

بہر حال عالمِ اسلام میں جمہوری عمل کی کمزور تو ہے لیکن داخلی سطح پر کچھ بہتری کی کوششیں بھی ہو رہی ہے۔ اس وقت ہم مابعد عالمگیریت کے دور میں ہیں جہاں خامیوں پر تنقید کی جاسکتی ہے۔ ساری دنیا کے مدنی معاشروں میں ہر ملک کے سیاسی معاملات پر گفتگو ہوتی ہے جس سے بہتری کی گنجائش پیدا ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جمہوریت اب ملکوں کا داخلی مسئلہ نہیں رہا ہے بلکہ سیاسی مسائل پر ہر جگہ بات ہوتی ہے اور ایک دوسرے کے نظام و مسائل پر مکالمہ ہوتا ہے۔ اس سے امید کی جاسکتی ہے کہ مسلم دنیا میں سیاسی عمل مزید بہتری کی جانب آگے بڑھے گا۔

بین الاقوامی تعلقات اور قوانین؛ پاکستان کے تناظر میں جائزہ

احمر بلال صوفی

احمر بلال صوفی پاکستان کے نامور قانون دان اور بین الاقوامی قانون کے ماہر ہیں ۔انہوں نے بین الاقوامی فورمز پر پاکستان کی نمائندگی کی، وہ فرانس میں جج اور سابق وفاقی وزیر قانون بھی رہ چکے ہیں۔ اس وقت 'ریسرچ سوسائٹی برائے بین الاقوامی قانون' کے نام سے ایک ادارہ چلاتے ہیں ۔اس لیکچر میں انہوں نے بین الاقوامی قوانین ومعاہدات کی نوعیت اور بعض جزئیات پر بات کی ہے،اور پاکستان کے تناظر میں اس کا تجزیہ کیا ہے۔

قانون سے میرا تعلق کیسے بنا؟

میں نے پہلے بین الاقوامی تعلقات کا شعبہ اختیار کیا تھا۔ لیکن آج سے 35 سال پہلے جب میں گورنمنٹ کالج لاہور سے گریجویٹ ہوا تھا، تو میرا پہلا ارادہ ایل ایل بی کرنے کا تھا۔ میرے والدین دونوں ڈاکٹر تھے۔ والد صاحب ہری پور سے تھے اور والدہ دلی سے تھیں۔ان کی شادی کوئٹہ میں ہوئی تھی اور میں لاہور میں پیدا ہوا تھا۔ میری ابتداء سے ہی قانون میں دلچسپی تھی اور میں نے سوچا تھا کہ میں صرف وکالت ہی کروں گا۔اس لیے میں نے دیگر شعبوں میں بہت سے مواقع ترک کر دیے، جیسے سی ایس ایس، بینک کی ملازمت، وغیرہ۔ میرا ہدف صرف یہ تھا کہ میں وکیل بنوں۔اس کی وجہ یہ تھی کہ

میں بچپن میں قائدِ اعظم کی ایک تصویر سے متاثر ہو گیا تھا۔ میں نے ان کی ایک تصویر دیکھی تھی جس میں وہ ایک وجیہ اور پر وقار لباس پہنے ہوئے اپنی لائبریری میں کھڑے ہیں۔ یہ تصویر مجھے بہت متاثر کن لگی۔ قائدِ اعظم کی شخصیت میں ایک خاص وقار اور عظمت تھی۔ مجھے لگا کہ یہ وقار اور عظمت ان کے پیشے سے وابستہ ہے۔ میں نے فوراً ارادہ کیا کہ میں ان جیسا وکیل بنوں گا۔ لیکن پھر مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ یہ پیشہ اتنا لچکدار ہے کہ اگر آپ اپنا ماڈل اور اپنی اقدار درست رکھیں تو آپ نہ صرف اس پیشے میں کامیاب ہو سکتے بلکہ اس میں آپ اپنے معاشرے، اپنے ملک اور اپنے مذہب کے لیے اچھا کردار ادا کر سکتے ہیں۔

اس پیشے میں آنے کے بعد پہلے میں نے اپنے آپ کو مالی طور پر مضبوط کیا۔ پھر میں نے اپنے پیشے میں آٹھ سے دس سال تک بہت محنت کی۔ کیسز میں پیش ہوا اور مقدمات کی نمائندگی کی۔ یہ تینوں چیزیں اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے مجھے حاصل ہوئیں اور میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے یہ تین چیزیں عطا کی ہیں۔ ان تین چیزوں کی بدولت میں اس پیشے میں کامیاب ہو سکا۔ اس پیشے سے میں نے اتنا پیسہ کمایا کہ میں نے دفتر کے لیے بہترین جگہ خریدی، اس میں عمارت بنائی۔

اس کے علاوہ مجھے بین الاقوامی قانون کا شوق بھی تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ بین الاقوامی قانون کی سمجھ سے بہت سی چیزیں بہتر کی جا سکتی ہیں۔ میں نے اپنے ملک، معاشرے کے لوگوں، پیشہ ور دوستوں کی بہت سی چیزوں میں رہنمائی کی۔ میں نے اکثر دیکھا کہ جب لوگ پاکستان کے مسائل پر بات کرتے ہیں تو وہ جذباتی نقطہ نظر رکھتے ہیں۔ کیمبرج میں تعلیم حاصل کرتے ہوئے میں نے یہ سمجھنے کی کوشش کی کہ پاکستان کے کیا مسائل ہیں

اور سب سے بنیادی مسائل کیا ہیں۔ کیونکہ بین الاقوامی قانون (international law) کا تعلق حکومت سے نہیں ہے کہ کون ملک کے اندر اقتدار میں ہے اور کون صوبے میں اقتدار میں ہے۔ اس لیے کہ بین الاقوامی قانون کا سارا تعلق ریاست کے مخصوص مسائل سے ہے۔ حکومتی مخصوص مسائل (Regime specific issues) بمقابلہ ریاستی مخصوص مسائل (state specific issues)، یہ دونوں مختلف چیزیں ہیں۔

حکومتی مخصوص مسائل (Regime specific issues)

حکومتی مخصوص مسائل کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ حکومتی ڈھانچے میں کیا ہو رہا ہے۔ جیسے گورنر ہیں یا نہیں۔ انتخابات کب ہونے ہیں یا نہیں ہونے، سپریم کورٹ نے کچھ کہا تو اس کا کیا مطلب ہے۔ گویا، حکومتی مخصوص مسائل وہ مسائل ہیں جو کسی مخصوص حکومت سے متعلق ہوتے ہیں اور مقامی ہوتے ہیں۔

ریاستی مخصوص مسائل (state specific issues)

ریاستی مخصوص مسائل وہ مسائل ہیں جو کسی ریاست سے متعلق ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک ریاست کی سرحدیں، اس کی قومیت، یا اس کا قانونی نظام۔

اگر آپ مجھ سے پوچھیں کہ آپ پاکستان کے کن معاملات پر کام کرتے ہیں تو میں کہوں گا کہ میں ریاستی مخصوص معاملات پر کام کرتا ہوں۔ حکومتی مخصوص معاملات کو میں نے اپنے نصاب سے باہر رکھا ہے۔ کشمیر ریاستی مخصوص مسئلہ ہے۔ ڈیورنڈ لائن کا

تنازعہ ریاستی مخصوص مسئلہ ہے۔ سندھ طاس اور سیاچن کے جو تنازعات ہیں، انڈیا اور پاکستان کے درمیان، یہ بھی ریاستی مخصوص مسئلہ ہے۔

ہمارے ہاں اکثر وکلاء کا رجحان حکومتی مخصوص مسائل کی طرف ہو جاتا ہے وہ کبھی کسی حکومت کے، کبھی کسی سیاسی جماعت کے وکیل کے طور پر کام کرتے ہوئے اپنے پیشہ ورانہ کردار سے ہٹ جاتے ہیں۔ میں نے 30 سال سے اپنا نقطہ نظر اسی پر رکھا ہے کہ جو ریاست کا معاملہ ہے اسے ریاست تک محدود ہونا چاہیے۔ مثال کے طور پر چین کے ساتھ اگر معاہدہ ہوگا، تو وہ معاہدہ چین کے ساتھ ہوگا، اس کے موجودہ صدر کے ساتھ نہیں۔ اسی طرح امریکا کے ساتھ معاہدہ کریں گے، تو وہ امریکہ کی ریاست کے ساتھ ہوگا اس کے موجودہ صدر کے ساتھ نہیں ہیں۔ اسی طرح جو ملک پاکستان کی ریاست کے ساتھ جو معاہدے (sign) سائن کر لیتے ہیں، تو وہ مسلسل چلتے ہیں۔ جو میرا فوکس تھا وہ (state specific issues) ریاستی مخصوص مسائل تھا۔ اس پر لوگوں نے کام نہیں کیا تھا، اس پر طویل مدتی منصوبہ بھی تیار نہیں کیا گیا تھا۔

ریسرچ سوسائٹی آف انٹرنیشنل لاء کا قیام

جب میں نے بین الاقوامی قانون (International law)) میں داخلہ لیا، تو مجھے کوئی تحقیقی مقالہ نظر نہیں آیا۔ مجھے اس پر بہت حیرانی ہوئی کہ ایک ایسا موضوع جو پاکستان کے ہر باشندے کے دل کے قریب ہے، اس پر کوئی تحقیق نہیں ہو رہی ہے۔ کشمیر پر لوگ جان دینے کو تیار تھے لیکن تحقیق کرنے کو تیار نہیں تھے۔ جیسا کہ میں نے دوسرے مختلف موضوعات سے سیکھا ہے کہ جب تک آپ انہیں تحقیقی طور پر لکھ کر

اکاڈیمک سطح(academic level) پر پیش نہیں کرتے تو آپ اپنے موضوعات کو آگے نہیں بڑھا سکتے۔اس لیے میری یہ دلچسپی تھی کہ میں اس موضوع پر تحقیق کروں۔ میں نے اپنی تلاش شروع کی اور سوچا میں کس ادارے سے رابطہ قائم کروں، لیکن مجھے معلوم ہوا کہ پاکستان میں کوئی ایسا ادارہ نہیں ہے جو بین الاقوامی قانون پر تحقیق کرتا ہو۔یہ میرے لیے بہت حیرانی کی بات تھی کیونکہ دنیا کے تمام غیر مسلم ممالک، چاہے وہ امریکہ ہو، فرانس ہو، برطانیہ ہو، یا بھارت ہو، ان سب نے بین الاقوامی قانون کے لیے تھنک ٹینک (Think Tank) قائم کیے ہوئے تھے اور پاکستان میں ایسا کوئی ادارہ نہیں تھا۔

میں نے 1988 میں حکومت کے مختلف اداروں سے رابطہ کیا اور درخواست کی کہ بین الاقوامی قانون کا کوئی ادارہ قائم کیا جائے لیکن اس وقت میں ایک جوان وکیل تھا اور میری بات کو کوئی سننے والا نہیں تھا۔اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ میں خود ہی اس ادارے کو قائم کروں گا۔ میں نے نیت کی کہ اگر اللہ مجھے اتنے پیسے دے کہ میں اس ادارے کو قائم کرنے کے قابل ہو جاؤں تو میں یہ کام کروں گا۔10 سال کی طویل محنت کے بعد میرے پاس اتنے پیسے جمع ہو گئے کہ میں اس فیصلے پر عمل کر سکا۔ میں نے لاہور کے رنگ روڈ پر ہائی کورٹ کے قریب سات مرلے کی زمین خریدی،اس پر عمارت کھڑی کی اور اس کی جو دوسری منزل تھی اسے میں نے بین الاقوامی قانون کی تحقیق کے لیے عطیہ کر دیا۔ اس سوسائٹی کا نام "ریسرچ سوسائٹی آف انٹرنیشنل لاء(Research Society of International law)" رکھا۔یہ اب کافی مشہور ہے اور اس کی ویب سائٹ دنیا بھر میں دیکھی اور پڑھی جاتی ہے۔

جب یہ ادارہ بنا تو یہ صرف ایک تصور تھا۔ اسے متعارف کرانے کے لیے 10 سال محنت کی گئی اور اس کے بنیادی پیغام کو لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کی گئی کہ بین الاقوامی قانون ہمارے ملک اور مسلمانوں کے لیے کیوں اتنا اہم ہے۔ کیونکہ آج کے دور میں کسی بھی جنگ کو لڑنے یا اپنے مفادات کا تحفظ کرنے کے لیے بین الاقوامی قوانین کے اسلحے کے ذریعے معاہدے اور مذاکرات کرنے ہوتے ہیں۔ یہ عمل اب مسلسل جاری ہے۔ یہ تحقیقی سوسائٹی آف انٹرنیشنل لاء قائم ہوئی اور اسے 20 سال اور لگے۔ میری وکالت کا کچھ حصہ اسلام آباد میں سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ میں پیش ہونے سے متعلق تھا تو 10 سال پہلے میں نے اسلام آباد میں آفس بنایا اور پھر آر۔ایس۔آئی RSI کی تیار ہوئی۔ آج وہ ٹیم ماشاء اللہ بڑی مستند ہے۔ اور (R.S.I.L) آر۔ایس۔آئی۔ایل کی حیثیت یہ ہے کہ پچھلے سال اس ٹیم کے دو لوگ (Harvard Law School) ہارورڈ لاء اسکول میں داخل ہوئے ہیں۔ عام طور پر ہارڈ صرف ایک بندہ ایک ملک سے لیتا ہے۔ یہ ایک استثنائی بات تھی کہ دو لوگ اس ادارے میں ماسٹر زپروگرام کے لیے منتخب ہوئے اور ابھی بھی آپ آر۔ایس۔آئی کی ویب سائٹ پر کسی بھی وقت جا کے دیکھیں تو آپ لوگوں کو پاکستان کے (state specific issues) ریاستی مخصوص مسائل کے حوالے سے بڑا مستند اور بہترین تحقیقی کام وہاں ملے گا۔ ایک پوری ٹیم ہے جو کام کر رہی ہے اور اس کا فائنانشل ماڈل ڈیویلپ ہو گیا ہے۔ اس کو دیکھتے ہوئے ریاست نے بھی کوششیں کی ہیں۔ وزارت اقتصادیات نے ونگ بنایا اور مختلف جگہوں پر تھنک ٹینکس بنے۔ اب تو پرائیویٹ یونیورسٹی میں سے انٹرنیشنل لاء کے تھنک ٹینکس بن رہے

ہیں۔اور امید ہے کہ یہ سلسلہ آگے بڑھے گا۔اس گفتگو کا مقصد آج کی نئی نسل کو اس سارے قضیے سے متعارف کروانا تھا۔

پاکستان اور بین الاقوامی قانون کا فریم ورک

موضوع کے نقطہ نظر سے ایک یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ پاکستان اور بین الاقوامی قانون کا فریم ورک کیا ہے؟ میرا یہ موقف ہے کہ پاکستان میں قائدِ اعظم محمد علی جناح خود ایک بین الاقوامی قانون کے پریکٹیشنر (Practitioner) تھے کیونکہ پاکستان کی ریاست کو Integrate کرنے کے لیے جو معاہدے چاہیے تھے وہ انہوں نے کیے تھے۔مثال کے طور پر جو بہاولپور ریاست کے ساتھ بین الاقوامی معاہدہ ہے، جس سے وہ پاکستان کا حصہ بنی۔اسی طرح قلات کی جو ریاست ہے، اس کے بعد گوادر کی ریاست ہے، سوات کی ریاست ہے۔ اسی طرح ریڈ کلف اوارڈ کے بعد پنجاب کی تقسیم ہوئی۔ قائدِ اعظم محمد علی جناح نے مختلف ریاستوں کے ساتھ جو بین الاقوامی معاہدے اور دستاویزات پر دستخط کیے وہ بہت اہم ہیں۔ قائدِ اعظم کا جو یہ کردار ہے، یہ اکثر نظر انداز کیا جاتا ہے اور اس بارے میں لوگوں نے کم بات کی ہے۔کیونکہ وہ ایک انتہائی مہنگے وکیل تھے، بہت Competent تھے اور ان کے تقریباً تمام کلائنٹس بڑی شخصیات تھیں اور ذاتی دوست بھی۔

پاکستان میں قوانین کی مجموعی تعداد

اب یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ رُول آف لاء ((Rule of Law سے کیا مراد ہے؟ تو جواب ہے کہ آئین کی بالادستی۔ رول آف الاء کا مطلب صرف آئین کی بالا دستی نہیں ہے۔ آئین کے علاوہ بھی پاکستان میں بہت سے قوانین موجود ہیں جیسے فیڈرل قوانین، صوبائی قوانین، اور صدارتی فرمان۔ ان تمام قوانین کو بھی آئین کے مطابق ہونا چاہیے۔ پاکستان میں وفاقی قوانین کی تعداد تقریباً آٹھ ہزار ہے اور صوبائی قوانین کی تعداد تقریباً ساڑھے تین ہزار ہے۔ اس طرح پاکستان میں مجموعی طور پر تقریباً تیرہ ہزار قوانین ہیں۔ یہ قوانین پاکستان کے اندر ہر شعبے پر لاگو ہوتے ہیں، چاہے وہ معاشرتی ہوں، ٹریفک، زمین کی ملکیت یا معاہدات کے حوالے سے ہوں۔ رول آف لاء (Rule of (law کا مطلب ہے کہ قانون کا نفاذ کیا جائے۔ یہ نفاذ آئین، وفاقی اور صوبائی قوانین اور بین الاقوامی معاہدوں کے ذریعے ہوتا ہے۔ روزمرہ کی زندگی میں، ہمیں رول آف لاء کے تحت CDA کے قوانین، ایکسائز کے قوانین اور ٹریفک کے قوانین پر عمل کرنا ہوتا ہے۔ یہ قوانین ہماری ذاتی زندگی میں بھی ہمارے سماجی تعلقات کا حصہ ہیں۔ اسی طرح بین الاقوامی معاہدوں کی تعداد پاکستان کے قوانین سے زیادہ ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ رول آف لاء کو سمجھنے کے لیے بین الاقوامی معاہدوں کا بھی علم ہونا ضروری ہے۔

پاکستان کے بین الاقوامی معاہدات

پاکستان نے مختلف ممالک کے ساتھ ہزاروں معاہدے کیے ہیں۔ یہ معاہدے دو قسم کے ہوتے ہیں: دو فریقین کے مابین معاہدے (Bilateral) اور زیادہ فریقوں کے مابین معاہدے(Multilateral)۔

بائی لیٹرل معاہدے (Bilateral agreement) دو ممالک کے درمیان ہوتے ہیں، جیسے کہ پاکستان اور ایران کا تجارتی معاہدہ۔ بائی لیٹرل معاہدے پاکستان کے قوانین سے زیادہ طاقتور ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ اگر کوئی پاکستانی قانون کسی بائی لیٹرل معاہدے کے خلاف ہے، تو معاہدہ قانون پر غالب آئے گا۔ پاکستان نے ایران، افغانستان، بھارت، نیپال اور آذربائیجان سمیت بہت سے ممالک کے ساتھ بائی لیٹرل معاہدے کیے ہیں۔

ملٹی لیٹرل معاہدے (Multilateral agreement) ایک سے زیادہ ممالک کے درمیان ہوتے ہیں، جیسے کہ اقوام متحدہ کا چارٹر اور معاہدے۔ ایسے معاہدات بنیادی طور پر قرآن کا بھی ایک حصہ ہیں۔ قرآن بھی یہی کہتا ہے کہ جو کچھ آپ نے کہا، اس کو آپ پورا کریں۔ تو جو بھی آپ معاہدے میں داخل ہو گئے ہیں، ذاتی حیثیت میں، اجتماعی حیثیت میں، ملک کی حیثیت میں، آپ نے اس معاہدے کو پورا کرنا ہے۔

قرآن اور بین الاقوامی قانون

اگر قرآن کے حوالے سے دیکھا جائے تو اس چیز کو محسوس کیا جا سکتا ہے کہ معاہدے کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ ذاتیات کے حوالے سے، پیسے کے لین دین، آپ جب کالج میں ایڈمٹ ہوتے ہیں وہ Admission letter جو ملتا ہے اس میں بھی Terms and Conditions اور دو سال یا تین سال کا معاہدہ ہوتا ہے۔ یہ بھی معاہدہ ہے۔ اس کو بھی آپ پورا کریں گے۔

قرآن کے الفاظ ہیں:

"یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ"

(اور وہ کیوں کہتے ہو جو کر نہیں سکتے؟)

بنیادی طور پر ہم قرآن کے معاہدے کے فریم ورک کو بہت ہی ہلکا لیتے ہیں اور یہ ہماری بد قسمتی ہے کہ ہم اسے سنجیدگی سے نہیں لیتے۔ جبکہ بنیادی طور پر معاشرتی ہم آہنگی کا انحصار اس معاہدے کے عمل درآمد پر ہے کہ کس یقین کے ساتھ اسے آپ نے تھام رکھا ہے۔ اسی طرح جو قانونی معاہدے بھی ہیں ان تمام قوانین کا بنیادی طور پر قرآن کی رو سے نافذ کرنا بہت ضروری ہے۔ کیونکہ آئین ایک معاہدہ ہے اور آئین کے تحت یہ ایک سماجی معاہدہ ہے۔ نصاب میں آپ کو یہ سماجی معاہدہ پڑھایا جاتا ہے۔ یہاں آئین سے مراد صرف چند صفحات کا متن نہیں ہے بلکہ آئین کے تحت آنے والے تمام قوانین بھی ہیں۔ اس معاہدے کی تعریف قرآن میں ان الفاظ میں آئی ہے کہ قرآن کا جو معاہدہ ہے وہ بندے اور اللہ کے درمیان ہے۔ آپ کو اس بات کا بھی پتہ ہے کہ جب آپ

ایمان والے بنتے ہیں، تو قرآن آپ کو بتاتا ہے کہ دیکھو اگر تم مومن بننا چاہتے ہو اور ایمان والے بننا چاہتے ہو، تو معیاری شرائط پر مبنی ایک معاہدہ (Standard Term Contract) تمہیں اللہ تعالی کی طرف سے پیش کیا جارہا ہے جو کہ اس کی کتاب ہے۔

معیاری شرائط پر مبنی معاہدہ (Standard Term Contract)) کیا ہوتا ہے؟

یہ وہ معاہدہ ہے جو بنانے والا تیار کر کے آپ کے سامنے رکھ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر آپ نے میری بات ماننی ہے تو اس کو پورا سائن کر دیں، یہ جیسا بھی ہے ویسے ہے۔ Standard Term Contract ایک نئی اصطلاح ہے۔ 50-60 سال پہلے ایسی کوئی اصطلاح نہیں تھی۔ البتہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ قرآن کا معاہدہ نہیں ہو سکتا کیونکہ اس میں مذاکرات کا تصور نہیں ہے۔ چونکہ مذاکرات دونوں طرف سے ضروری ہوتے ہیں۔ جبکہ قرآن کو ترتیب دی گئی تھی تو انسانوں سے تو نہیں پوچھا گیا تھا۔

Standard Term Contract کی مثال ایسے دی جا سکتی ہے کہ جب کبھی انشورنس کا معاہدہ سائن کیا جاتا ہے تو انشورنس کمپنی بہت موٹا معاہدہ، جس میں بے شمار چیزیں شامل ہوتی ہیں، سامنے رکھ دیتی ہے اور وہ کہتے ہیں آپ یہ سائن کر دیں۔ اسے کہتے ہیں معیاری شرائط کا معاہدہ ((Standard Term Contract۔ اسی طرح آپ نے قسطوں پر کوئی موٹر سائیکل یا گاڑی لینی ہے تو جس کمپنی یا جس بینک سے لینی ہے وہ آپ کے سامنے 'سٹینڈرڈ ٹرم ایگریمنٹ' رکھتے ہیں، جو پہلے سے چھپا ہوا ہوتا ہے اور اس پر کوئی مذاکرات یا بات چیت نہیں ہوتی۔ آپ صرف اس کو سائن کرتے ہیں۔

اسی طرح قرآن بھی ایک سٹینڈرڈ ٹرم معاہدہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو پیش کیا جاتا ہے۔ جب آپ لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھ لیتے ہیں تو براہ راست اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاہدہ کرتے ہیں اور اس کے تمام احکامات، جیسے ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک، لوگوں کے ساتھ حسنِ سلوک، رشتہ داروں کے ساتھ اچھا سلوک، اللہ تعالیٰ کو ماننا، اور اس کے پیغمبروں کو ماننا، یہ سب اس کے اہم ترین احکامات ہیں۔ آپ کو ان تمام احکامات کو قبول کرنا ہوگا۔ ان احکامات میں سے سب سے اہم حکم اور ذمہ داری یہ بھی ہے کہ آپ اپنے معاہدوں کو پورا کریں اور لوگوں کے ساتھ جو وعدہ آپ کرتے ہیں اسے پورا کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ "جب آپ معاہدے کریں تو ان کو پورا کریں"۔ ایمان اور تقویٰ کی تعریف میں ایک اضافی نکتہ یہ ہے کہ اگر آپ اللہ تعالیٰ کا بہترین بندا اور ایمان والا بننا چاہتے ہیں تو اپ جو معاہدے کرتے ہیں ان کو پورا کریں اور اور یہی آپ کو ایمان کی اعلیٰ سطح پر فائز کر سکتا ہے، جہاں آپ اللہ تعالیٰ کے اور قریب ہو جاتے ہیں۔

قرآن اور امریکا کا آئین

میں نے جب قرآن پہلی بار ترجمے سے دیکھا اور پڑھا تو میں نے محسوس کیا کہ یہ امریکا کے آئین سے ملتا جلتا ہے۔ امریکا جو دنیا کی سب سے بڑی اقتصادی طاقت ہے، اس کے آئین کا پہلا آرٹیکل کہتا ہے کہ کوئی قانون ایسا نہیں بنایا جا سکتا جو کسی معاہدے کے خلاف ہو۔ دنیا میں اقتصادی طاقت بننے والے معاشرے اپنے آئین میں معاہدوں کی بالادستی کو یقینی بناتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں جب ہم معاہدوں کو نافذ کرنا شروع

کرتے ہیں تو ہماری معیشت کا پھیلاؤ، ترقی کا عمل اور سماجی ہم آہنگی کی تعمیر شروع ہو جاتی ہے۔ آپ کے آپسی اختلافات قانون کے دائرے میں حل ہوں گے۔ ایک بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ قانون کی بالادستی سے مراد ایک عام شہری کے لیے قانون کی بالادستی ہے۔ لیکن ایک مسلمان شہری کے لیے اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو قرآن کے احکامات پر بھی عمل کرنا ہے۔ قرآن آپ کے ان تمام معاہدوں کی حفاظت کرتا ہے جو آپ لوگوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ چاہے وہ دوستوں کے ساتھ ہوں، رشتہ داروں کے ساتھ ہوں، ملازمین کے ساتھ، یا کسی اور کے ساتھ ہوں۔ لہذا یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ ان تمام معاہدوں کی اسلام اور قرآن میں کیا حیثیت ہے۔ یہ معاہدہ جو اللہ تعالیٰ کا ہمارے ساتھ ہے اس میں دنیاوی معاہدے بھی اہم ہوتے ہیں۔ جب تک میں ایک اچھا قانون کا پابند شہری نہیں بنوں گا، ایک اچھا مسلمان بننا میرے لیے مشکل ہوگا۔ کیونکہ قانون کی بالادستی قرآنی احکامات کی بالادستی کا ایک لازمی جزو ہے۔ اسی طرح اگر آپ قانون کی بالادستی کو دیکھیں تو اس کے مطابق نہ صرف آپ کو ذاتی معاہدوں کو پورا کرنا ہے، بلکہ ریاست کے قوانین پر بھی عمل کرنا ضروری ہے۔

اسلام اور بین الاقوامی قوانین

میں نے اس عنوان پر بات نہیں کی کہ اسلام ایک دین ہے جو متنوع اجزا پر مشتمل ہے۔ بنیادی طور پر اسلام تمام اجزا کے تعلق کی بنیاد پر سمجھ میں آتا ہے۔ اگر آپ حضور پاک ﷺ کی زندگی کو سمجھنا چاہتے ہیں تو وہ بھی تمام اجزا کے فریم ورک میں سمجھ میں آتی ہے۔ اسی طرح قرآن کا تقاضا بھی یہ ہے کہ اسے اس کے تمام اجزا کے ذریعے سمجھا

جائے اور وسیع فرایم ورک کا لحاظ کیا جائے۔ ہم اگرچہ یہ کہتے ہیں کہ قرآن آفاقی کتاب ہے اور قرآن ہماری زندگیوں میں شامل ہے، لیکن ہم اسے عام طور پہ مکمل طور پہ تمام اجزس کے ساتھ سمجھ نہیں پاتے۔

قرآن کے حوالے سے غلط فہمی

دنیا میں کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ قرآن ایک قدیم دستاویز ہے، اور ہمیں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ قرآن اتنے سو سال پہلے آیا تھا اور یہ آج کے جدید دور پر لاگو نہیں ہوتا۔ میں اس نظریے سے متفق نہیں ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ قرآن کے اجزا کا وسیع فریم ورک ہماری روزمرہ کی زندگی کا حصہ ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں آئین کی ایک عمرانی معاہدہ ہے اور آپ آئین کے بنیادی اصولوں کو نہیں بھول سکتے اور نہ آپ ان میں کسی بھی قسم کی تبدیلی کر سکتے ہیں۔ میں نے اس تھیوری پر کام کیا ہے۔ میں نے ایک آرٹیکل لکھا ہے جس میں بتایا ہے کہ قرآن کی بنیادی ساخت بھی مخصوص اصولوں اور اجزاء پر مشتمل ہے۔ یہ واضح اور مستحکم اجزا ہیں اور ان میں تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ قرآن کے بنیادی اجزاء میں توحید، رسالت، نبوت، کتاب، آخرت، عدل، احسان، عفو وغیرہ شامل ہیں۔

اس حوالے سے ایک اور پہلو یہ بھی ہے کہ جب آپ کوئی نیک کام کرتے ہیں تو آپ کی ایک غرض ہوتی ہے، وہ غرض یہ ہوتی ہے کہ مجھے ثواب ملے گا۔ جب آپ اس غرض کے ساتھ نیک کام کرتے ہیں تو یہ بھی ایک معاہدہ ہوتا ہے۔ اس معاہدے کے تحت آپ اللہ تعالی سے وعدہ کرتے ہیں کہ آپ نیک کام کریں گے اور اللہ تعالی آپ کو ثواب عطا کرے گا۔ اسی طرح اللہ تعالی بھی اپنی طاقت اور صلاحیتوں کی ضمانت دیتا ہے اور وہ اپنے

بندوں سے وعدہ کرتا ہے کہ وہ ان کی مدد کرے گا، ان کی حفاظت کرے گا اور ان کے نیک کاموں کا صلہ دے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک نیا اور غیر روایتی نقطہ نظر ہے، لیکن یہ اسلام کی ایک نئی تفہیم پیش کرتا ہے۔ یہ تفہیم اسلام کو جدید دنیا میں بھی قابل عمل اور متعلق بنا سکتی ہے۔ اسلام ایک وسیع اور جامع دین ہے اور اسے سمجھنے کے لیے مختلف نقطہ ہائے نظر کی ضرورت ہے۔

رسولُ اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ میں معاہدوں کی اہمیت

رسولُ اللہ ﷺ نے بہت سے حوالوں سے سکھایا ہے کہ وہ ایک مثالی انسان تھے اور وہ بین الاقوامی قانون کے بھی ایک پریکٹیشنر تھے۔ اس زمانے میں جب قبائل ایک دوسرے کے ساتھ تعلقات رکھتے تھے تو ان کے درمیان معاہدے اور قوانین ہوتے تھے اور یہ قوانین بین الاقوامی قانون کے تصور کی بنیاد پر بنتے تھے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف قبائل کے ساتھ معاہدہ کیے اور یہ معاہدے بین الاقوامی قانون کے اصولوں پر مبنی تھے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں قبائل کے درمیان ایک بازار لگنے کا معاہدہ کرایا تھا اور اس معاہدے میں یہ طے کیا گیا تھا کہ بازار میں تمام لوگوں کو آنے اور جانے کی اجازت ہو گی اور کوئی بھی شخص کسی اور کی عبادت میں رکاوٹ نہیں ڈالے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بین الاقوامی قانون کے اصولوں کو فروغ دیا اور دنیا کو ایک پرامن جگہ بنانے میں مدد کی۔ آپ ﷺ نے Transit States کے تصور کو بھی فروغ دیا۔ ٹرانزٹ سٹیٹ ایک ایسی ریاست ہوتی ہے جہاں لوگوں کو آزادانہ طور پر سفر کرنے اور تجارت کرنے کی اجازت ہوتی

ہے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کو ایک ٹرانزٹ سٹیٹ کے طور پر قائم کرنے کی کوشش کی اور دیگر قبائل کو بھی اس بات پر راضی کرنے کی کوشش کی کہ وہ اپنے علاقوں کو ٹرانزٹ سٹیٹ بنائیں۔ یہ ایک اہم کام تھا کیونکہ اس سے دنیا بھر کے لوگوں کے لیے سفر اور تجارت آسان ہوئے۔ جب کوئی مجھ سے سی پیک CPEC وغیرہ کے بارے میں بات کرتا ہے تو میں انھیں بتاتا ہوں کہ ٹرانزٹ سٹیٹ کا تصور ہمارے پیغمبر ﷺ کی سنت کا ایک اہم حصہ تھا اور آپ ﷺ نے اسی طرح کے معاہدوں سے مکہ اور مدینہ کی معیشتوں کو بھی بہتر بنایا۔ آپ ﷺ تاجروں کو معیاری شرائط پر قیام کی اجازت دی اور وہ جو بازار لگانے کا معاہدہ کیا تھا وہ اصل میں آزاد تجارت کا معاہدہ تھا۔ آج کیعالمی تجارتی تنظیم ((WTO اسی طرح کے تصور پر قائم ہے۔ آج آپ کو یہی سکھایا جارہا ہے کہ آپ اپنی مصنوعات کو دنیا میں کہیں بھی لے جا سکتے ہیں اور اس پر کوئی پابندی نہیں ہے۔

عالمی تجارتی تنظیم (WTO) کا قیام

1993 میں جب WTO کا تصور آیا تو اس سے پہلے کیا نظام تھا؟ اس سے پہلے ہر ملک میں تجارتی رکاوٹیں لگائی گئی تھیں۔ یعنی کسٹم ڈیوٹیاں بہت زیادہ تھیں۔ ایسے ہی یہ سوچ تھی کہ ہمیں جو ضرورت ہے اسے اپنے ملک میں بنانا چاہیے۔ باہر سے کچھ بھی چیز امپورٹ(Import) نہیں کرنی چاہیے۔ نہ یہ پنیر، نہ دودھ، نہ دہی، غیرہ، جو جو ہم اکثر کھاتے ہیں، کچھ بھی باہر سے نہ آئے۔ ہندوستان میں پرانی گاڑیاں چل رہی تھی، جو ایمبیسڈر گاڑی کا 50 کا پرانا ماڈل تھا وہی چل رہا تھا۔ پھر 1993 میں دنیا نے بیٹھ

کر Multilateral trade اور Investment protocol جیسے معاہدوں پر دستخط کیے اور کہا کہ ہم یہ تجارتی رکاوٹیں ختم کرتے ہیں۔ ملکوں کو آزادی ہونی چاہیے کہ وہ جو بھی درآمد اور برآمد کرنا چاہیں، وہ کریں۔ جس ملک کے پاس جو ذرائع اور ذخائر ہیں وہ ان سے چیزیں تیار کریں اور باقی ملکوں کو بھیجیں۔ اگر چین سائیکل اچھی بناتا ہے تو پاکستان کیوں اپنی محنت ضائع کرے؟ پاکستان لال ٹین، چارپائی یا کچھ اور اچھا بناتا ہے تو وہ ان چیزوں کو برآمد کرے اور اگر گاڑی اچھی بناتا ہے، تو وہ گاڑیاں برآمد کرے۔ اسی طرح اگر کوئی ملک معدنیات اچھی نکال سکتا ہے تو وہ منرل برآمد کرے۔ یہ عالمی تجارتی تنظیم کا معاہدہ تھا۔

ایک دلچسپ بات جو کہ قابلِ ذکر ہے کہ چین نے سب سے پہلے اِس چیز کو سمجھا اور اس پر عمل کیا۔ اس نے سمجھا کہ WTO کا کیا اثر پڑے گا۔ جب بین الاقوامی قانون متعارف کرایا گیا تو چین نے اس موقع کو غنیمت جانا اور اس نے کہا، "اگر ہم اپنا مال بنانا شروع کر دیں، اور ہم اپنی مینوفیکچرنگ کو بہتر بناتے رہیں، تو پھر مال کو پہنچنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی"۔ چین نے بہت سی فیکٹریاں لگائیں، صنعتیں قائم کی، چیزیں بنائیں، اور دولت کمائی۔ اس نے دنیا بھر میں اپنی مصنوعات کو فروخت کرنے کے لیے کاروباری دروازے کھول دیے اور آہستہ آہستہ، چین اپنی مصنوعات کی پیداوار اور برآمد میں بہت آگے نکل گیا۔ جب امریکیوں کو یہ احساس ہوا کہ چین نے ڈبلیو-ٹی-او کے نظام کا فائدہ اٹھا کر انہیں پیچھے چھوڑ دیا ہے اور اب وہ اس صورتحال کو تبدیل یا واپس نہیں کر سکتے تو انہوں نے چین پر سیاسی دباؤ ڈالنا شروع کیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ بات بہت اچھے طریقے سے جانتے تھے کہ کہ اگر اپ اپنے معاہدے کو اچھی طرح سے سے مرتب کر سکتے ہیں تو اس کے اچھے اثرات ہمیشہ کے لیے دنیا پر رہ جائیں گے۔ صلح حدیبیہ کے سیاسی اور اقتصادی فوائد کتنے اچھے نکلے۔اس کی مثال آج بھی دی جاتی ہے۔

اقوام متحدہ کا چارٹر، ایک اہم سنگ میل

عصر حاضر کا سب سے اہم معاہدہ اقوام متحدہ کا چارٹر (UN Charter 1945) ہے۔ یہ معاہدہ کیوں اہم ہے؟ میں نے اس پہ "قانونی سنگِ میل (Legal Milestone)" کے نام سے ایک کتابچہ لکھا، اور اسے سب سے اہم تاریخی بین الاقوامی قانون قرار دیا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ 1945 سے پہلے تقریباً یہ قانون تھا کہ آپ دنیا میں کسی بھی ملک کو فتح کر سکتے ہیں، وہاں اپنا جھنڈا لہرا سکتے ہیں اور اس ملک کے مالک بن سکتے ہیں۔ طاقت کا استعمال کرنا درست تھا، یعنی آپ نے کسی ملک پر قبضہ کیا، اپنا گورنر وہاں مقرر کیا اور واپس چلے گئے اور وہ ملک آپ کا ہو گیا۔ مثال کے طور پر جیسے محمد بن قاسم نے کہا کہ میں دیبل فتح کرنے جا رہا ہوں۔ وہ دیبل پہنچے اور دیبل کا قلعہ فتح کیا اور وہاں اپنا جھنڈا لہرا دیا۔اسی طرح طارق بن زیاد نے اسپین میں کشتیاں جلائیں اور اس ملک کے مالک گئے کیونکہ انہوں نے اس پر قبضہ کر لیا۔ تو یہ ایک اصول تھا۔

1945 میں اس دو ہزار سال پرانے اصول کو تبدیل کر دیا گیا۔اقوام متحدہ کے چارٹر (UN Charter) میں یہ کہا گیا کہ اب طاقت کی بنیاد پر کسی ملک پر قبضہ کرنا جائز نہیں ہے۔اب کوئی ملک کسی دوسرے ملک کی زمین پر طاقت کی بنیاد پر قبضہ نہیں کر سکتا۔ اگر

کوئی ملک کسی دوسرے ملک کی زمین پر قبضہ کر بھی لیتا ہے تو اس قبضے کے بعد بھی اس ملک کی اصل ملکیت یا اس کا نام تبدیل نہیں ہوگا، اس کا تعلق اسی ملک کے لوگوں سے رہے گا۔ 1965 کی جنگ میں پاکستان کے بریگیڈیئر سائیداد خان کمانڈنگ آفیسر تھے، وہ کھیم کرن کے علاقے میں اپنے ساتھیوں سمیت 30 کلو میٹر آگے تک چلے گئے اور انہوں نے کہا کہ یہ علاقہ ہم نے اپنی تحویل میں لے لیا ہے۔ ان کو جواب ملا کہ ٹھیک ہے ابھی آپ اس علاقے کو رکھیں، لیکن بعد میں اقوام متحدہ کی جانب سے سیز فائر کے بعد انہیں اس علاقے سے واپس جانا پڑا۔

اقوام متحدہ چارٹر کا بنیادی طور پر یہی مقصد تھا کہ اپ کسی دوسرے ملک کی ملکیت نہیں لے سکتے۔ 1971ء میں مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش کیوں بنایا گیا؟ حالانکہ ہندوستان کی فوج وہاں موجود تھی اور 90 ہزار پاکستانی فوجی ان کے سامنے ہتھیار ڈال چکے تھے۔ ہندوستان نے اسے اپنے ملک میں ضم کیوں نہیں کیا؟ ایک نیا صوبہ کیوں نہیں بنالیا؟ اس وقت تو کوئی بنگلہ دیشی حکومت نہیں تھی۔ لیکن ہندوستان نے ایسا نہیں کیا، کیونکہ اقوام متحدہ کے چارٹر میں یہ سب ممنوع ہے۔ اس چارٹر کی رو سے تو آپ کسی قوم کو آزاد کروا سکتے ہیں لیکن کسی کے ملک پر زبردستی قبضہ نہیں کر سکتے۔ یہ ہمارے لیے سب سے بڑا، بنیادی اور اہم نکتہ تھا لیکن اس پر کبھی کسی نے توجہ نہیں دی۔

حیرت انگیز بات ہے کہ کسی بھی جدید اسلامی اسکالر نے اقوام متحدہ کے چارٹر کو اہمیت نہیں دی۔ قرآن کی تفسیروں اور دیگر اسلامی تحقیق میں اس چارٹر کا ذکر تقریباً نہ ہونے کے برابر ملتا ہے اور اگر کہیں ملتا بھی ہے تو معمولی انداز میں۔ میرے سامنے ایک پرانی کتاب گزری ہے، اس کتاب میں جنیوا کنونشنز کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ کنونشنز 1949 میں

منظور کیے گئے تھے،اور وہ کتاب 1950 میں شائع ہوئی تھی۔اُس زمانے میں گوگل نہیں تھااور لوگوں کے لیے جنیوا کنونشنز تک پہنچنا بھی آسان نہیں تھا۔اس کتاب کے مصنف نے جنیوا کنونشنز کو بین الاقوامی قانون کی ترقی کی ایک مثال کے طور پر پیش کیا۔اب تو دنیا گلوبل ہوگئی ہے، مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اس بارے پڑھیں اور اس کی اہمیت کو سمجھیں۔

ڈاکٹر حمید اللہ نے بھی جنیوا کنونشنز پر کام کیا تھا،اور انہوں نے اپنے لیکچرز میں ان کا حوالہ دیا۔اگر اس سطح کے سکالرز کو بین الاقوامی قانون پر کام کرنے کا زیادہ وقت ملتا تو وہ اسے زیادہ درست انداز میں مسلمانوں کو سمجھا سکتے۔ اقوام متحدہ کے چارٹر کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ ریاستیں اپنی سرحدوں کو تبدیل نہیں کر سکتیں۔اس اصول کے مطابق جو سرحدیں جنگ سے پہلے طے ہو چکی ہیں وہ برقرار رہنی چاہئیں۔ فلسطین اور کشمیر کے معاملات اس اصول کے خلاف ہیں۔اسی لیے یہ دونوں خطے تنازعہ کا باعث ہیں اگر آپ افریقہ کا نقشہ اٹھا کر دیکھیں تو ان سرحدوں کی تقسیم انتہائی غیر فطری ہے۔ یہ سیدھی لائنیں ہیں جو قبائلی تنوع کو نظر انداز کرتی ہیں۔ یہ سرحدیں انگریزوں نے 1945 کے ارد گرد یا اس سے پہلے کھینچی تھیں اور ان کے جانے کے بعد اقوام متحدہ کے چارٹر کے تحت ان کو حتمی حیثیت مل گئی۔ان سرحدوں کی وجہ سے افریقہ میں بہت سی قبائلی جنگیں ہوئی ہیں۔ یہ جنگیں اتنی خوفناک تھیں کہ ان میں لاکھوں لوگ مارے گئے۔ لیکن ان جنگوں کے باوجود کسی نے بھی ان سرحدوں کو تبدیل کرنے کی کوشش نہیں کی۔اس کی وجہ یہ تھی کہ اقوام متحدہ کو ڈر تھا کہ اگر ان سرحدوں کو تبدیل کیا گیا تو بین الاقوامی امن کو خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ یہی صورتحال ڈیورنڈ لائن کی بھی ہے۔ ڈیورڈ

لائن ایک معاہدہ ہے۔ جب آج انڈیا ڈیورنڈ لائن کو تبدیل کرنے کی بات کرتا ہے تو اس پر اعتراضات ہوتے ہیں۔ ان اعتراضات میں سے ایک یہ ہے کہ انڈیا اکھنڈ بھارت کے سابقہ فریم ورک کو دوبارہ نافذ کرنے کی بات کر رہا ہے جس فریم ورک میں نیپال، افغانستان، بنگلہ دیش اور سری لنکا بھی شامل تھے۔

بین الاقوامی قانون کے ذرائع

اب ہمیں ایک نئی حکمت عملی بنانے کی ضرورت ہے۔ اس حکمت عملی کو بنانے کے لیے، ہمیں بین الاقوامی قانون کے ذرائع کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ بین الاقوامی قانون کے ذرائع میں معاہدے، بین الاقوامی رسم و رواج، اور قانون کے عام اصول شامل ہیں۔ میں اکثر لوگوں سے یہ سوال سنتا ہوں کہ کوئی ایسی کتاب بتائیں جو بین الاقوامی قانون پر سارا کچھ سمجھا دے۔ ایسی کوئی کتاب نہیں ہے۔ یہ جاننے کے لیے کہ بین الاقوامی قانون کے ذرائع کیا ہیں، آپ میرے 15 سال پرانے لیکچرز دیکھ سکتے ہیں جو ریکارڈ ہوئے تھے۔ میں آپ کو سمجھا دوں گا کہ بین الاقوامی قانون کے چار ذرائع ہیں: پہلا ذریعہ Treaties معاہدے ہیں۔ معاہدے دو یا دو سے زیادہ ریاستوں کے درمیان طے کیے جانے والے قواعد ہیں جو بین الاقوامی قانون کا حصہ بن جاتے ہیں۔ دوسرا ذریعہ International customs Related Law ہیں۔ دنیا میں کچھ بین الاقوامی رسوم و رواج اور اصول ہیں جو ریاستوں کے مسلسل اور باقاعدہ باہمی تعامل کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں۔ تیسرا ذریعہ عدالتی فیصلے (Judicial Decisions) ہیں جو عالمی بین الاقوامی عدالتوں سے صادر ہوتے ہیں۔ چوتھا ذریعہ علمی قانونی آراء

(Academic Writings) ہیں۔ Academic Writings سے مراد بین الاقوامی قانون کے ماہرین کی رائے ہے۔

ایک اور اہم چیز بین الاقوامی ادارے ہیں جو مسلسل قانون سازی کے عمل کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ اگر آپ انسانی حقوق پر کام کر رہے ہیں یا ثقافتی ورثے پر کام کر رہے ہیں، جیسے کہ تخت بھائی اور مردان کا علاقے میں یہ ورثہ ملتا ہے، تو آپ کو اس پر کام کرتے ہوئے دیکھنا پڑے گا کہ اس حوالے سے کوئی بین الاقوامی معاہدہ ہے یا نہیں۔ یونیسکو کا "ثقافتی ورثے کے تحفظ اور فروغ کے لیے پروگرام" ایک ایسا ہی معاہدہ ہے۔ اب آپ دیکھیں کہ کوئی کسٹم ہے یا نہیں۔ کسٹم سے مراد یہ ہے کہ عراق میں جو جنگ ہوئی تو اس زمانے میں ثقافتی ورثے کو کس طرح کی حفاظت ملی۔ مصر میں، وسطی ایشیا میں، اور ویتنام میں جنگوں کے دوران ثقافتی ورثے کو محفوظ رکھا گیا یا نہیں۔ اسی طرح، آپ ٹیکسلا کے دستاویزات کو دیکھ سکتے ہیں کہ ٹیکسلا کتنا پرانا ہے اور یہ ایک ثقافتی ورثے کی جگہ ہے اور اس لیے ثقافتی ورثے کی جگہوں کے لیے ایک مخصوص تصور بین الاقوامی تصور اور ڈھانچہ وضع کیا گیا ہے۔

میں اسپین گیا ہوا تھا اور وہاں قرطبہ جانا ہوا۔ ہمارے گائیڈ نے بڑا فخر کیا کہ قرطبہ دنیا کا واحد شہر ہے جس میں تین ثقافتی ورثے کے مقامات ہیں جنہیں عالمی سطح پر تحفظ دیا گیا ہے۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ گوگل پر چیک کریں کہ لاہور میں ایسی کتنی جگہیں ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ لاہور میں بھی تین ہیں: وزیر خان مسجد، شالیمار باغ، جہانگیر کا مقبرہ اور بادشاہی مسجد۔ بین الاقوامی قوانین بہت وسیع ہوتے ہیں۔ ریاستوں کو ان کی پابندی کرنی ہوتی ہے اور اس کا دنیا کے امن وامان میں بڑا کردار ہے۔

ثقافتی ورثہ، بین الاقوامی ورثہ

ثقافتی ورثہ کا تصور یہ ہے کہ بین الاقوامی کمیونٹی کسی خاص ملک یا علاقے کے ثقافتی ورثے کو مشترکہ وراثت کے طور پر تسلیم کرتی ہے۔ اس تصور کی بنیاد یہ ہے کہ ثقافتی ورثہ کسی ایک فرد یا گروہ کی ملکیت نہیں ہے بلکہ یہ سب انسانوں کی مشترکہ میراث ہے۔ 1945 میں ہونے والی یونیسکو کی جنرل کانفرنس میں ثقافتی ورثے کی حفاظت کو بین الاقوامی قانون کا حصہ بنادیا گیا۔ اس کانفرنس میں "ثقافتی ورثے" کی تعریف یہ کی گئی: "وہ تمام چیزیں جو انسانی ثقافت کی تخلیق ہیں، بشمول فنون، ادب، ٹیکنالوجی، تعمیرات، اور قدرتی ماحول کے عناصر جو انسانی ثقافت سے جڑے ہوئے ہیں"۔ یونیسکو نے ثقافتی ورثے کی حفاظت کے لیے کئی معاہدے بھی کیے ہیں جن میں سے ایک 'عالمی ثقافتی ورثے کے تحفظ کا کنوینشن' بھی ہے۔ اس قانون کے تحت، یونیسکو عالمی ثقافتی ورثے کے طور پر ان مقامات کی فہرست بناتا ہے جو انسانی ثقافت کے لیے غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ پاکستان میں بھی ثقافتی ورثے کی حفاظت کے لیے کئی قوانین اور پالیسیاں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک "ثقافتی ورثہ (تحفظ) ایکٹ، 1975" بھی ہے۔ اس ایکٹ کے تحت پاکستان میں ثقافتی ورثے کے مقامات کو "ثقافتی اثاثہ" قرار دیا گیا ہے ٹیکسلا کے ارد گرد ہونے والی ہاؤسنگ سوسائٹی کیس میں، پاکستان کی سپریم کورٹ نے ایک فیصلہ دیا تھا جس میں اس بات کی تصدیق کی گئی تھی کہ ٹیکسلا کی تاریخی یونیورسٹیوں کے مقامات عالمی ثقافتی ورثے کے مقامات ہیں۔ اس فیصلے کے بعد ان مقامات پر کوئی تعمیراتی کام نہیں ہو سکتا۔

تو یہ وہ عدالتی فیصلے یا بین الاقوامی فیصلے ہیں جو عالمی عدالتوں نے صادر کیے ہیں اور وہاں رجسٹرڈ ہیں اور ان کی حفاظت کے اصول و ضوابط بھی طے کیے گئے ہیں جس کے لیے باقاعدہ ادارے موجود ہیں۔ بین الاقوامی قوانین سے تعارف اور ان کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے ہمارے معاشرے میں بھی بہت کام کرنے کی ضرورت ہے۔

پاکستان میں جمہوریت کا مستقبل

خورشید ندیم

خورشید ندیم معروف کالم نگار ہیں اور سماجی دانشور ہیں۔ اس وقت رحمت للعالمین وخاتم النبیین اتھارٹی کے چیئرمین کے طور پہ کام کررہے ہیں۔زیرنظر مضمون میں غیرجانبدارانہ انداز میں ان تمام عوامل کا سرسری تجزیہ کیا گیا ہے جو سماجی بھی ہیں، سیاسی بھی اور مذہبی وتعلیمی بھی۔ مصنف کے خیال میں پاکستان کے اندر جمہوریت کی کمزوری کو صرف کسی ایک طبقے کے ساتھ نتھی کرنا درست نہیں ہے بلکہ یہ ایک پھیلا ہوا عمل ہے اور اس کا باریکی کے ساتھ تجزیہ کرنا چاہیے۔

پاکستانی معاشرہ کیاجمہوریت کی برکات سے کبھی فیضیاب ہو سکے گا؟آگہی کے وسیع ہوتے امکانات کے باوجود مجھے مستقبل قریب میں تو اس کے آثار دکھائی نہیں دے رہے۔آج عوام کی شعوری سطح ماضی کے مقابلے میں کہیں بلند ہے۔ یہ بے حجابی کا دور ہے۔جو پنہاں ہے،دراصل ظاہر ہے۔عام شہری بھی اقتدار کے حقیقی اور ظاہری مراکز کا فرق اچھی طرح جان گیا ہے۔اس کے باوصف جمہوریت کا پودا سرسبز ہوتا دکھائی نہیں دے رہا۔اس کے ایک سے زیادہ اسباب ہیں۔

سب سے بڑا سبب سیاسی جماعتوں کی عدم یک سوئی ہے۔ بڑی سیاسی جماعتوں کی پہلی ترجیح آج بھی اقتدار ہے،جمہوریت نہیں۔وہ شرکتِ اقتدار کے ہر فارمولے کو قبول کرنے پر آمادہ رہتی ہیں،اگر انہیں شراکت دار مان لیا جائے۔ دوسرا سبب بھی سیاسی

جماعتوں ہی سے متعلق ہے۔ پاکستان میں سیاسی جماعتوں کے نام سے جو گروہ پائے جاتے ہیں، انہیں سیاسی جماعت بنانے کی کوئی شعوری کوشش نہیں ہوئی۔ اقتدار پسندوں کو جمع کر کے، انہیں ایک جماعت کا نام دے دیا گیا ہے۔

مذہبی سیاسی جماعتوں میں صرف جماعت اسلامی اپنی قیادت کے انتخاب میں جمہوری اصولوں کا اہتمام کرتی ہے اور اس کا کارکن دوسروں کے مقابلے میں زیادہ باشعور ہے۔ اس کا مسئلہ مگر یہ ہے کہ اس کا تنظیمی ڈھانچہ کسی سیاسی جماعت کے لیے سازگار نہیں۔ وہ دراصل ایک تحریک کے طور پر منظم کی گئی ہے جو سیاسی جماعت سے زیادہ ایک فوجی نظم سے قریب تر ہے۔ دوسری مذہبی سیاسی جماعتیں موروثیت کے اصول پر کھڑی ہیں اور مذہب کے نام پر کارکنوں سے وفاداری کا تقاضا کرتی ہیں۔ جمہوریت ظاہر ہے کہ وہاں بھی نہیں ہے۔

تیسرا سبب ایک موثر مذہبی طبقہ ہے جو جمہوریت پر یقین نہیں رکھتا۔ وہ طالبان کو آئیڈلائز کرتا اور جمہوریت کو کفر قرار دیتا ہے۔ یہ طبقہ میڈیا کو دجال کہتا ہے اور اس کے ساتھ میڈیا سے اپنے حصے سے زیادہ حصہ وصول کرتا ہے۔ یہ ابلاغ کے تمام ذرائع کو استعمال کرتے ہوئے اس کی تبلیغِ عام کرتا ہے کہ جمہوریت سے نجات ہی میں ہماری نجات ہے۔ سماج میں لوگ اس سے اثر قبول کرتے ہیں اور ان کی پرجوش مہم کے نتیجے میں ایک تعداد ایسی بھی ہے جو جمہوریت ہی کو غلط سمجھتی ہے۔

چوتھا سبب، دانشور طبقہ ہے جو جمہوریت کے معاملے میں فی الجملہ کوئی واضح موقف نہیں رکھتا۔ لبرل طبقہ غالباً واحد گروہ ہے جو اس باب میں مکمل ذہنی یک سوئی رکھتا

ہے۔ وہ اسے لبرل ازم کے نظامِ فکر کی روشنی میں دیکھتا ہے۔ یا پھر ہم جیسے چند متفرق افراد جو اسے کسی نظری پس منظر کے بجائے، انتقالِ اقتدار کے واحد پُرامن حل کے طور پر دیکھتے اور اسے انسانی فکر کی ایک غیر معمولی دریافت سمجھتے ہیں جو الہامی تعلیمات سے متصادم نہیں۔ لبرل طبقہ اور یہ لوگ محدود دائرۂ اثر رکھتے ہیں۔ دانشوروں کی اکثریت اب بھی محدود جمہوریت' کی قائل ہے جس میں بظاہر اقتدار سیاست دانوں کے پاس ہو مگر کلیدی فیصلوں کا مرکز کوئی دوسرا ہو' جو ان کے خیال میں زیادہ لائقِ اعتبار ہے۔

پانچواں سبب وہ حلقہ ہے جو اقتدار کو اپنے ہاتھوں میں رکھنا چاہتا ہے۔ اہلِ سیاست کو اسی کے اشارے پر ناقابلِ بھروسا ثابت کیا جاتا ہے تاکہ ان کا حقِ اقتدار ثابت ہو سکے۔ اس کے خیال میں ریاست کے مفاد کا یہ تقاضا ہے کہ اسے ان ہاتھوں میں نہ سونپا جائے جو عوام کے منتخب کردہ ہیں۔ اس سوچ کا ماخذ بھی یہی ہے کہ ملک کے عوام درست فیصلے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اس سوچ کو پھیلانے والے ان معنوں میں پڑھے لکھے ہیں کہ ان کے ہاتھ میں کوئی نہ کوئی ڈگری ہے۔ عام طور پر طبیعیاتی علوم کا پس منظر رکھتے اور سماجی علوم سے ناآشنائے محض ہیں۔ یہ عام مجالس میں اکثر یہ گفتگو کرتے ملیں گے کہ یہ پارلیمنٹ کیسے قانون سازی جیسا فریضہ سرانجام دے سکتی ہے جس کی اکثریت ان کے نزدیک جاہل ہے۔

چھٹا سبب ہمارا نظامِ تعلیم ہے۔ یہ نظام جمہوری سوچ پیدا نہیں کرتا۔ اس میں تاریخ کا مطالعہ بھی اس طرح کرایا جاتا ہے کہ وہ افراد کے کارہائے نمایاں کا ایک ریکارڈ ہے اور انسانی تاریخ کی تشکیل میں عوام کا کوئی کردار نہیں۔ آئین کیا ہے، اس کی حرمت کیا ہوتی ہے، ہمارا تعلیمی نصاب ان تصورات سے خالی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قوم کے اندر آئین اور

جمہوریت کے بارے میں کوئی حساسیت پیدا نہیں ہو سکی۔ اس کا فائدہ غیر سیاسی عناصر اٹھاتے ہیں۔ یہ آخری سبب جمہوریت پر ایک اہم اعتراض کو بھی تقویت پہنچاتا ہے۔ عوام چونکہ جمہوریت کے فکری پس منظر سے واقف ہیں اور نہ ہی اس کے اثرات سے، اس لیے وہ محض ووٹ دینے کو جمہوریت سمجھ لیتے ہیں۔ یوں وہ ووٹ کا حق ایسے لوگوں کیلئے بھی استعمال کرتے ہیں جو سماج کیلئے مضر ہیں۔ پچھلے الیکشن میں ایک ایسی جماعت کو بائیس ہزار ووٹ ملے جو عدالت، ریاست اور باشعور عوام کی نظر میں انتہا پسندی کو پھیلانے کی مرتکب تھی۔

لیکن یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ جمہوری طریقے سے تو متشدد جماعتیں بھی ووٹ حاصل کر لیتی ہیں پھر اس کا کیا فائدہ ہے؟ میرے نزدیک یہ ایک کمزور اعتراض ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ عوام کی اکثریت نے کبھی ایسے لوگوں کا انتخاب نہیں کیا۔ دوسرا یہ کہ عوام کی اکثریت ایک سیاسی شعور رکھتی ہے جو اس نے روایتی بصیرت سے اخذ کیا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ اقتدار کسے سونپا جائے۔ تیسرا یہ کہ جمہوریت میں خود احتسابی کی سب سے زیادہ صلاحیت ہے۔ عوام اپنے فیصلوں پر نظر ثانی کرتے رہتے ہیں، شرط یہ ہے کہ انہیں مسلسل اس کا موقع دیا جائے۔

میرا احساس ہے کہ پاکستان میں ان اسباب کے خاتمے کے لیے ایک بڑی سماجی تحریک کی ضرورت ہے۔ ایسی تحریک جو عوامی سطح پر جمہوریت کا شعور اجاگر کرے۔ اس کا مفہوم اور مدعا واضح کرے۔ مخالفین کی پھیلائی غلط فہمیوں کا ازالہ کرے۔ اس کے بغیر سیاست اقتدار کے لیے سودے بازی کے ایک کھیل کے سوا کچھ نہیں۔

پاکستانی جمہوریت کو درپیش چیلنجز

ظفراللہ خان

ظفراللہ خان آئینی و پارلیمانی امور کے ماہر ہیں۔'پاکستان انسٹی ٹیوٹ برائے پارلیمانی خدمات' کے ڈائریکٹر رہ چکے ہیں۔ اس لیکچر میں انہوں نے آئین کی تاریخ پر کلام کیا ہے۔ اس کے علاوہ پاکستان کے آئین میں انسانی حقوق پر روشنی ڈالی ہے اور پاکستان میں دستور کے عملی نفاذ میں درپیش مشکلات و مسائل پر بھی تفصیل سے بات کی ہے۔

دستور کی اہمیت اور دستور کے مطابق شہریوں کے آئینی حقوق

دستور کیوں ضروری ہوتا ہے؟ دستور بنانا کوئی کفریہ کام نہیں ہے کیونکہ ہم بہت ساری چیزوں کو مذہب کے تناظر میں بھی دیکھتے ہیں، میثاقِ مدینہ چالیس آرٹیکلز پہ مبنی تحریری دستور ہے، گویہ تحریری دستور رکھنا سنتِ نبوی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہے۔ ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دستور کے ذریعے کس طرح پاکستان کو بہتر کیا جائے۔ آج کل نوجوان اکثر ٹیوٹر پہ مجھ سے اکثر کہا جاتا ہیں کہ آپ نے اتنا ہمیں آئین پڑھایا لیکن دیکھیے ہمارے ساتھ کتنی زیادتی ہو رہی ہے اور آپ آواز نہیں اٹھاتے؟ حالانکہ میں نے آواز اٹھائی۔ انسانی عزت کی حرمت برقرار رکھنا بنیادی حق ہے۔ آئین کے حقوق میں احتجاج کرنا ہمارا آئینی حق ہے۔ یہ غلط فہمی ہے کہ لوگوں کا احتجاج کرنا، آگ لگانا، املاک کو نقصان پہنچانا اور اپنے غصے کا اظہار کرنا ہے۔ آرٹیکل 16 کہتا ہے "فریڈم آف اسمبلی" عوام کو اجتماع کرنے کا حق حاصل ہے۔ ہر شہری کو پرامن طریقے سے بغیر ہتھیاروں

کے، پیٹرول کے، ڈنڈے لاٹھیوں کے بلکہ پرامن طریقے سے جمع ہونے کا حق حاصل ہے۔ یہ جو دھڑا دھڑ خوشی میں فائرنگ ہو رہی ہوتی ہے، اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ اگر اسلامی تعلیمات سے رہنمائی لی جائے تو راستوں کو بند کرنے عمل کو قبیح فیل کہا گیا ہے۔ بات بات پہ لوگ آگ لگانے آجاتے ہیں اور وہ لوگ ڈنڈے لے کر ہنگامہ کرتے ہیں۔ اس سے عام شہری نقصان کے ڈر سے اپنی گاڑی بھی سڑک پہ نہیں لے کے جاتا۔ آئین آگ لگانے اور ویپنائز (Weaponize) کرنے کا حق نہیں دیتا بلکہ آئین اس کے قوانین کی خلاف ورزی پہ سزا معین کرتا ہے۔ اگر کوئی سیاسی جماعت احتجاج کر رہی ہے تو اس کے اثاثے ضبط کر کے جن لوگوں کی املاک کو نقصان پہنچا ان کے نقصان کو پورا کریں اور یہ سندھ پہلی بار کرنے جا رہا ہے۔ حالیہ احتجاج میں جتنے لوگوں کی موٹر سائیکلیں جلی اور جو لوگ گرفتار ہوئے ان کی جائیدادیں ضبط کریں گی اور سب کو موٹر سائیکلیں خرید کر دی جائے گی۔ اس قدم سے ہمارے ملک میں احتجاج پرامن ہو جائے گا۔

انسانی معاشرے کی ارتقا

جب انسانی معاشرہ تشکیل پایا تو دیگر فلاسفرز نے بھی جس انداز سے انسانی ارتقا کو دیکھا ہے تو ان کے مطابق اولین معاشرہ شکاریوں کا تھا، ایک شکار کر کے لاتا اور سب کو کھلاتا، لہذا کمانے والے نے سوچا کہ میں اکیلا کیوں کما کر سب کو کھلا رہا ہوں۔ اس نے باقی سب کو کہا کوئی آگ جلائے گا، کوئی پانی کا انتظام کرے گا، کوئی کپڑے تیار کرے گا، تو کوئی جوتے بنائے گا، یہ ہمارا قدیم سماج تھا جو اس انداز سے بنا۔ جب آبادی بڑھتی چلی گئی تو وہ

شکاریوں کا سردار بن گیا، کیونکہ وہ فخر کرتا تھا کہ اس کے ارد گرد کے سارے لوگ اس کے احکامات کے تابع ہیں اگر کوئی بات کرے گا تو اسے کھانا نہیں ملے گا۔ پھر کس نے جیل دریافت کی کہ نافرمانی کرنے والوں کو تو قید کیا جائے گا۔ پھر رفتہ رفتہ جب قبائل بڑھتے چلے گئے تو ایک سے زیادہ سردار بنے۔ پھر علاقوں اور وسائل پہ لڑائیاں شروع ہوئیں۔ قدیم یونان میں ایک چھوٹی سی ریاست سٹی سٹیٹ (City State) نے سوچا کہ لوگ جب جنگوں پہ جاتے ہیں تو کئی عورتیں بیوہ ہو جاتی ہیں، کئی بچے یتیم ہو جاتے ہیں اور اس کے ساتھ مال وزر بھی اجڑ جاتا ہے اور بہت بربادی ہوتی ہے تو لہذا اجتماعی طور پہ فیصلہ کیا جائے گا کہ کس جنگ میں جانا چاہیے اور کس میں نہیں جانا چاہیے اور اسی طرح زندگی سے متعلق اور فیصلے جیسے اپنا محلہ، شہر کیسے صاف رکھنا ہے، اس میں کس کو رہنے کی اجازت دینی ہے اور کس کو رہنے کی اجازت نہیں دینی۔ جب یہ اجتماعی فیصلے شروع ہوئے تو اس میں دو طبقات خواتین اور غلاموں کو شامل نہیں گیا۔ بلکہ آزاد لوگوں کو یہ فیصلے کرنے کا حق دیا گیا۔ یہ آج سے ستائیس سو سال پہلے قبل از مسیح کی بات ہے جب جمہوریت کا ارتقاء اور جنم قدیم یونان میں آیا۔ یہ جمہوریت کی رسمی پیدائش تھی۔ سرداروں کے دور میں یہ قانون تھا کہ اگر کوئی ان کا زیادہ قریبی ہے تو اس کو مراعات ملیں گی۔

جرگہ اور پنچائیت سے الیکشن تک

لوگوں میں پنچایت کا اور جرگے کا رواج یعنی مل بیٹھ کر بات کرنے کے فیصلے کا رواج شروع ہوا۔ جمہوریت بنیادی طور پہ یہی ہے کہ جو فیصلے میری ذات کو متاثر کرتے ہیں آیا

اس میں میری آواز شامل ہے یا نہیں؟ اگر میری آواز شامل ہے تو اس کا کوئی طریقہ کار وضع ہو۔ پھر ووٹ کا نظام آیا۔ جب ووٹ کا نظام آیا تو ہر شہری کو ووٹ کا حق نہیں دیا گیا۔ خواتین اور غلاموں کو ووٹ کا حق نہیں دیا۔ یہ ستائیس سو سال پہلے کی بات نہیں بلکہ اٹھارویں - انیسویں صدی کی بات ہے۔ اٹھارویں صدی میں زیادہ لوگوں کے مطابق ووٹ کا حق صرف کسی جائیداد کے مالک کو ہو گا۔ برطانیہ جسے جمہوریت کی ماں کہتے ہیں وہاں بھی ووٹ کا حق صرف انہیں تھا جن کی زمینداری تھی۔ یہ بہت اشرافیہ قسم کا نظام تھا۔

پہلی بار جب عوام کو منتخب کرنے کا موقع ملا۔ ایک صاحب نے الیکشن لڑا اور وہ الیکشن جیت گئے تو سارے شرفاء نے کہا کہ اس کو ہم اپنے ساتھ نہیں بٹھائیں گے، انہوں نے کسی طرح سازش کر کے ان کو اسمبلی سے فارغ کروا دیا۔ پھر الیکشن ہوا اور پھر وہ جیت گئے۔ تب ایک تصور آیا کہ نمائندگی سونپنے کا حق عوام کے پاس ہے۔ وہ کسی بدمعاش کو سونپ دیں یا شریف کو سونپ دیں، کسی مالدار یا پھر غریب کو سونپ دیں، یہ ان کا اختیار ہے۔ جس کے پاس طاقت، گھوڑے، توپیں تھیں، اس نے فتوحات کی، غلام بنائے۔ غلاموں کو بڑے محدود اختیار تھے۔ ہمارے ہاں اداروں کا ارتقاء کی شروعات دور غلامی میں ہوئی۔

انقلاب فرانس-:

تاریخ انقلاب فرانس کے بارے میں مشہور واقعہ ہے کہ جب لوگ باہر مظاہرہ کر رہے تھے تو محل کے اندر ملکہ عالیہ نے پوچھا کہ یہ لوگ کیا مانگ رہے ہیں، کسی نے بتایا وہ

روٹی مانگ رہے ہیں کیونکہ ان کے پاس روٹی نہیں ہے، تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ لوگ ڈبل روٹی کیوں نہیں کھاتے۔ بادشاہوں کے مزاج تو شاہانہ ہوتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں ایک انقلاب فرانس برپا ہوا جس کے تین نعرے تھے یہ کہ آزادی، مساوات، یک جہتی۔ اور اسی سے معاشرہ بنتا ہے۔ 1879 میں ایک تاریخی دستاویز لکھی گئی، "انسانی حق اور شہری حق کا بل (Bill of rights of men and citizens) "۔

1989 میں اس کے 100 سال منائے گئے تو اس وقت کی وزیر اعظم بے نظیر بھٹو صاحبہ نے ہمیں بھی دعوت نامہ بھیجا اور ہم نے بھی شرکت کی۔ اس بل میں مین men شامل ہے تو وومن Women کیوں شامل نہیں۔ جمہوریت کے ارتقا میں ووٹ کا اختیار خواتین کو بہت بعد میں ملا۔ اس بل سے پہلی بار لوگ رعایا سے شہری بنے۔

رعایا سے شہریت تک

امریکہ بھی برطانیہ کی کالونی میں سول وار اور آزادی کی لہر شروع ہوئی تو بل آف رائیٹس (Bill of Rights)) لکھا گیا۔ تھامس جیفرسن Thomas Jefferson نے جب بل آف رائیٹس لکھنا شروع کیا "ہم رعایا (We the Subject) "، ابھی ان کی قلم کی سیاہی خشک بھی نہیں ہوئی تھی انہوں نے (Subject) رعایا کاٹ دیا اور لکھا کہ "وی دا سٹیزن (We the Citizen). "یہ ایک فقرہ لکھنے سے بل آف رائٹس میں فرق کیا آیا؟ تو اس کا فرق یہ پڑا کہ ہندوستان، کینیڈا، آسٹریلیا، امریکہ میں اس وقت برطانیہ کی کالونی تھی۔ ان میں سے بہت سارے آزاد بھی ہو گئے۔ ہماری جان اس دن

چھوٹی جس دن ہم نے اپنا آئین بنایا23۔مارچ 1956 کو پہلا آئین بنایا۔ دستور کے اندر ایک لفظ کہ وی دی سبجیکٹ اور وی دی سٹیزن دونوں کا یہ ایک بنیادی فرق ہے۔

برطانیہ میں سارا کام ان کی اسمبلیوں میں ہو رہا تھا گلوریس ریوولوشن (Glorious Revolution) سے لے کر 1998 کے بل آف رائیٹس تک شہریوں کو حقوق دینے کا کام ہوا۔ اس سفر میں کئی بار آزمائشیں آئی۔ عورتوں کے حق کے لیے ووٹ کے لیے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بیٹے دلیپ کی بیٹی بامبا اور صوفیہ دونوں بہنیں کوشش کیا کرتیں تھی اور جناح صاحب بھی جب وہاں پڑھتے تھے وہ خواتین کے حقوق کے لیے اور ووٹ کے لیے اس جدوجہد کا حصہ تھے۔ جنگ عظیم دوم کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ یہ صرف باتوں سے نہیں ہوگا۔ایک جمہوری معاشرے میں رہتے ہوئے ہر شخص کو ان کے حقوق کا پتا ہونا بہت ضروری ہے۔

آئین اور اسلام

الہامی مذاہب میں تین چار واقعات ہیں۔ حضرت عیسی علیہ السلام نے اپنے آخری وقت میں اپنے مصاحبین سے کچھ مشاورت کی تھی، نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شوریٰ میں لوگوں سے مشاورت کی۔ نبی ﷺ نے شوریٰ کا باہم اپنے امور میں مشاورت کیں۔اور مذاہب میں بھی اس کا تصور ملتا ہے۔ ہر مذہب کا ایک اپنا فلسفہ ہے، مثلا یہودیت میں حضرت سلیمان علیہ السلام کو بادشاہت ملی، حضرت موسی علیہ السلام نے جدوجہد کی فرعون سے لڑے۔ اور پھر مسیحت کی بادشاہتیں بنی اور رومی سلطنت نے اسکو کو قبول کیا۔

نوآبادیاتی نظام بھی ایک قانون تھا۔ لہٰذا قانون کے بارے میں یہ کہنا کہ قانون پہ عمل کرو تو قانون (Logical) بھی ہو سکتا ہے اور غیر انسانی بھی، اسی لیے قوانین کو بہتر بنانے کی کوشش کی جاتی رہتی ہے۔ پہلے زمانے میں آئین پتھر پہ لکھے جاتے تھے، یہاں تک کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دس احکام ربانی میں سے سات آج بھی یونیورسل ڈیکلریشن اف ہیومن رائٹس (Universal Declaration of Human rights) میں موجود ہیں۔ یا نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری خطبہ بھی انسانی حقوق کے ساتھ ملا کر پڑھیں تو اس میں بہت کچھ ملتا ہے۔

جمہوری ارتقا

ہر ملک کا اپنا جمہوری ارتقا مختلف ہے۔ اقوام متحدہ نے 15 ستمبر کو جمہوریت کا دن قرار دیا اس وقت کہا گیا کہ جمہوریت ہر ملک میں نہیں ہے وہاں پہ بحث مباحثے کے بعد یہ کہا گیا کہ جمہوریت کی کوئی ایک تعریف نہیں بلکہ جمہوریت کے کئی انداز ہیں۔ ایک پارٹی کی جمہوریت بھی ہو سکتی ہے جیسا کہ چین (China) میں ہے، دو پارٹی جمہوریت جیسا کہ امریکہ، ملٹی پارٹی جمہوریت اسی طرح پارلیمانی نظام، صدارتی نظام۔ لہٰذا جمہوریت صرف اسے مانیں گی جہاں امور طے کرنے کے لیے لوگوں سے پوچھا جائے گا۔

پاکستان کا قیام اور جمہوریت

پاکستان کا قیام بلاشبہ برصغیر کے مسلمانوں کے معاشی، اقتصادی، ثقافتی، مذہبی مفادات کے تحفظ کے لیے تھا۔ سرسید کہتے تھے کہ پڑھو گے نہیں تو نوکریاں نہیں ملیں گیں۔

اس لیے انہوں نے ن یونیورسٹیاں کھولیں۔ قائدِ اعظم محمد علی جناح بذات خود جتنے بھی جمہوری بندوبست تھے، ان میں سے زیادہ تر کا حصہ رہے۔ علامہ اقبال بھی پنجاب اسمبلی کے ممبر تھے جو لاہور سے منتخب ہوئے تو گویا یہ ثابت ہو جاتا ہیں کہ ہمارے تمام ملک بنانے والے اکابرین کسی نہ کسی انداز میں جمہوری اداروں کا حصہ رہے ہیں۔ اب جمہوری اداروں کی حیثیت آزاد تھی یا نہیں لیکن انہوں نے بہت کام کیے۔ جب ہم غلام تھے تو اسمبلی میں ہندو بچیوں کی کم عمری میں شادی کرنے کے لیے بل پیش ہوا۔ قائدِ اعظم مخالفت میں کھڑے ہوئے کہ میں یہ مان ہی نہیں سکتا کہ کوئی مذہب اس کی اجازت دیتا ہو کہ بچیوں کی شادی کم عمری میں کر دیں، اسلیے اس وقت شادی کی عمر 14 سال طے کی تھی۔

برصغیر میں سیاسی جماعتوں کی ابتدا

1885 میں سیاسی جماعتوں کا بننا شروع ہوا۔ ایک انگریز نے انڈین نیشنل کانگرس بنائی، 1906 میں مسلم اکابرین نے مل کے آل انڈیا مسلم لیگ بنائی، اس طرح مذہبی رہنماؤں نے جمعیت علمائے ہند 1919 میں بنائی، قائدِ اعظم ابتداء میں ہندو مسلم اتحاد کے سفیر تھے اور وہ واحد شخص تھے جنہوں نے دونوں پارٹیوں کا 1916 اجلاس جو لکھنو میں ہوا، دونوں کی صدارت کی۔ اس کے بعد انھوں نے دیکھا کہ 1919 کی اصلاحات میں ان کے مطالبات کو کانگرس نہیں مان رہی تو انھوں نے کانگرس سے علیحدگی اختیار کر لی۔ 1940 میں ایک سیاسی جلسہ ہوا جس میں قراردادِ پاکستان پیش ہوئی۔ اس سے پہلے 14 نکات ایک سیاسی دستاویز جس میں لکھا ہوا تھا کہ سندھ کو ممبئی سے الگ صوبہ بناؤ اور صوبوں کو

یکساں خود مختاری دو۔ آج ہم کہتے ہیں کہ وفاق کو کمزور کر کے صوبوں کو کیوں طاقتور کر رہے ہو۔ یہ تصور نہرو صاحب کا تھا جو آج بھی انڈیا میں موجود ہے۔

پاکستان کی آزادی کا فیصلہ برطانیہ کے پارلیمنٹ میں ہوا اور اسے آزادی ایکٹ 1947 کہتے ہیں۔ جس کے مطابق پاکستان میں علاقے تین طریقوں سے پاکستان کا حصہ بنے۔ تقسیم صرف دو علاقوں پنجاب اور بنگال کی ہوئی، قائدِ اعظم دونوں کی تقسیم کے خلاف تھے اور سارے فسادات اسی تقسیم کی وجہ سے تھے اس کی وجہ سے ہندو، سکھ آبادی کو اُس طرف جانا پڑا، مسلم آبادی کو ادھر آنا پڑا۔ بنگال میں بھی یہی ہوا، اس طرح ملک کی تقسیم ہوئی۔ یہ تقسیم کا فیصلہ کس نے کیا؟ یہ وہاں کی صوبائی اسمبلیوں نے ووٹ ڈال کے کیا کہ یہاں تقسیم ہو گی۔ اس کے بعد قائدِ اعظم نے سکھ رہنماؤں کو بہت منانے کی کوشش کی اور آج تک ہم منانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کرتار پور راہداری اس کی تازہ ترین مثال ہے۔ جب پنجاب نے فیصلہ کیا کہ ہم نے پاکستان کا حصہ بننا ہے تو اس وقت کے اسمبلی کے اسپیکر سردار بہادر مسیحی تھے اور ان کے سارے لوگوں نے پاکستان کے حق میں ووٹ ڈالا۔ اس لیے پاکستان کی اقلیتیں ذمی نہیں بلکہ انھوں نے تشکیلِ پاکستان میں حصہ لیا۔

دو اسمبلیوں کا تو میں نے ذکر کیا لیکن کیا صوبے میں ریفرنڈم ہوا؟ کانگرس کی حکومت تھی اور یہ ریفرنڈم کانگرس کی حکومت جیتی تھی لیکن آبادی مسلم زیادہ تھی۔ دوسرا ریفرنڈم آسام کے صوبے میں ہوا اور ووٹ کی قوت سے ہی فیصلہ ہوا۔ بلوچستان کے اس وقت دو حصے تھے ایک کو کمشنریٹ صوبہ بلوچستان (Commissionerate , Province of Baluchistan) کہتے تھے، ایک حصے میں قلات، مکران، سوات،

دیر، چترال کی ریاستیں تھی۔ یہ پاکستان کے صوبے میں آگئے ہیں، بہاولپور، خیر پور، میر پور، دیر، چترال، سوات یہ ساری بہت امیر ریاستیں تھیں۔ انہوں نے پاکستان کے ساتھ الحاق کیا۔

جمہوریت کیا ہوتی ہے؟

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جمہوریت کیا ہوتی ہے؟ جب قائدِ اعظم خان قلات کے پاس گئے اور انہیں بتایا کہ ملک چلانے کے لیے وسائل چاہیے۔ تو انہوں نے قائدِ اعظم کو سونے میں تولا، سوات والوں نے جہاز اور بہاولپور والوں نے تنخواہیں دیں۔ ہم نے اس کا ان کو کیا بدلا دیا؟ 75 سالوں کے بعد کہ بہاولپور اور سوات کہتے ہیں ہم پر غلامی کا دور قانون اب نافذ ہو رہے ہیں۔ بہاولپور کہتا ہے خدا کے لیے ہمیں جینے دو۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ ان ساری ریاستوں سے ان کے نام ختم کر کے ان کو ویسٹ پاکستان کا نام دیا گیا۔ اب وہ صوبے کہتے ہیں ہم نے خود کو پاکستان کا حصہ بنایا اور آپ نے ہمارا نام تک ختم کر دیا۔ جس وجہ سے 1971 کی تلخی کی کہانی موجود ہے۔ بنگال کا نام بھی ہم نے تبدیل کر دیا، یہ تلخ حقائق ہیں۔ میں دستور کو یوزر مینول آف سٹیٹ کرافٹ (User Manual of State Craft) کہتا ہوں۔ نام تبدیل کر کے بھی اگر جمہوریت میں ایک آدمی اور ایک ووٹ کی بات آتی ہے تو وزیرِ اعظم تو ہمیشہ ایسٹ پاکستان سے آتا ہے کیونکہ ان کی آبادی زیادہ ہے۔ اس پر ہم نے ایک ٹیریٹری کا فارمولہ (Territory Formula) لگایا کہ ڈیڑھ بنگالی ایک مغربی پاکستانی کے برابر ہے۔ انہوں نے یہ بھی تسلیم کیا کہ اس سے نظام چلے اور ہم دوبارہ اپنا حق لے لیں گے۔ نو سال کی محنت کے بعد 1956 میں پہلا

دستور بنا۔ جس میں ملک کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان تھا یہ ایک وفاقی طرز کا نظام تھا لیکن غلطی یہ کی تھی کہ واحد وفاق تھا۔ اکثر وفاق دوایوانوں پر مشتمل ہوتے ہیں کیونکہ کسی صوبے کی آبادی زیادہ ہو سکتی ہے۔ مثال کے طور پر امریکہ میں کیلیفورنیا (California) سب سے بڑی ریاست ہے وہاں سے پچاس کے قریب ممبر پارلیمنٹ آتے ہیں لیکن سینیٹر دو ہی ہوتے ہیں۔ اور یوتھا (Utah) بہت چھوٹی سی ریاست ہے اس کے بھی دو سینیٹرز آتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایسا نظام بنانے کی ضرورت ہیے کہ آبادی کے حساب سے کسی علاقہ کو اختیار نہ دیے جائے۔ ہمارا دستور دوایوانی نہیں تھا اور یہ نظام ترتیب دینے کا آرگنائزنگ پرنسپل (Organizing Principle) ہے، کہیں نہیں لکھا ہوا کہ جمہوریت صدارتی یا پارلیمانی، وحدانی، یا پھر وفاقی بھی ہو سکتی ہے۔ اس کے کئی مزاج ہیں۔

امریکہ جب پہلی بار بنا تو اس میں صرف 13 ریاستیں شامل تھیں اور انہوں نے کہا کہ اگر ہم اکھٹے ہو جائیں تو ہمارا دفاع مضبوط ہو جائے گا۔ کرنسی جو ہر کوئی اپنی اپنی بناتا ہے یہ ایک ہو جائے تو بہتری آجائے گی۔ اس کو کہتے Coming Together ہے، ایک ہوتا ہے Holding Together ایک ملک کے اندر جس میں متنوع معاشرے ہیں۔ اسکی بہترین مثال عام طور پوسٹ کنفلیکٹس سوسائٹیز (Post Conflict Societies) ہیں، ایتھوپیا Etopia، نیپال جو ٹوٹ چھوٹ کا شکار ہیں۔

پاکستان میں آئینی بحران کا سفر

آئین کے 928 دنوں کے بعد میجر جنرل سکندر مرزا نے جو اس وقت صدر پاکستان تھے اس وقت کے وزیر اعظم فیروز خان نون کو خط لکھا کہ "آئین اور ملک اکٹھے نہیں چل سکتے اور بد قسمتی سے یہ بات ہم نے ذہنوں میں نصب کر لی ہے کہ آئین اہم نہیں ہوتا بلکہ ملک اہم ہوتا ہے۔ قائد اعظم نے پہلی گیارہ اگست کی تقریر میں انھوں نے لکھا کہ آئین بر صغیر کے دستوری بحران کا واحد حل ہے،

1956 کے آئین کے بعد 1962 کا آئین شروع ہوتا ہے "I, Field Marshal Muhammad Ayub Khan do hereby enact this Constitution" وہ اتنا اچھا کانسٹیٹیوشن تھا کہ دولت سمٹ کے بائیس گھرانوں میں آگئی اور جب عوام کا احتجاج ہوا تو اپنا آئین اپنے ساتھ لے جاؤ۔ انہوں نے بھی ایک خط لکھا ان کے اپنے آئین میں لکھا ہوا تھا کہ جاتے ہوئے اقتدار میں قومی اسمبلی کے سپیکر کو دے کے جانا تھا انہوں نے ان کو بھی معذرت کا خط لکھا کہ Sorry میں آپ کو نہیں یحییٰ خان کو دے کر جا رہا ہوں۔ اس کے بعد ہمارے ملک کا یہ دستور بنا اور یہ پوسٹ کنفلیکٹ 70 کے انتخابات کے بعد جو کچھ ہوا، مشرقی پاکستان کا سانحہ اور بچے کچے پاکستان میں ہم نے نیا پاکستان بنانے کی کوشش کی۔ اب جمہوری رویہ کیا ہوتا ہے؟ سردار عطاءاللہ مینگل کی حکومت ذوالفقار علی بھٹو صاحب نے فروری 1973 میں ختم کر دی۔ پھر عراق کے سفارت خانے سے کوئی اسلحہ بر آمد ہوا، صوبے میں اس وقت حکومت مولانا مفتی محمود صاحب کی تھی، انھوں نے یکجہتی میں استعفیٰ دے دیا۔ اپریل 1973 میں سب نے مل کے 1973 کا دستور بنا دیا۔ اس پہ شاہ احمد نورانی، بزنجو، ذوالفقار علی بھٹو، مفتی محمود صاحب، ولی خان

صاحب، ظفر انصاری صاحب کے دستخط تھے۔ کسی نے بزنجو صاحب سے پوچھا کہ بھٹو صاحب نے تو آپ کی حکومت توڑ دی، آپ نے پھر بھی ان کے ساتھ مل کے آئین بنا دیا، انہوں نے کہا وہ ہماری سیاست ہے وہ ہم سیاسی میدان میں مقابلہ کریں گے اور آئین ملک کی ضرورت ہے، ملک کو چلانا ہے۔ یہ عملی مثال ہیں۔

دستور کو کتنے دن سلایا؟

یہاں بھی کہانی ختم نہیں ہوتی، پچھلی بار 928 دن چلایا تھا، پھر بھٹو صاحب کے دور میں 421 دن چلا۔ پھر ضیاء صاحب آ گئے، جنہوں نے 2898 دن اس آئین کو نیند کی گولی کھلا کے سلا دیا۔ مشرف صاحب آئے تو انہوں نے 1247 دن اسے نیند کی گولی کھلا کے سلا دیا۔ پھر جب یہ دونوں موجود بھی تھے تو تین ہزار سات سو اٹھاون دن یہ اوپر وردی پہن کے بیٹھے رہے، نیچے محمد خان جونیجو، میر ظفر اللہ جمالی، شوکت عزیز۔ یہ پھر جمہوریت تو نہیں رہی۔ پھر جب بچا کھچا آئین 1988 میں نواز شریف اور محترمہ بے نظیر صاحبہ کو نصیب ہوا، تو یہ کوئی چار ہزار کچھ دن چلا، میں اسے ملاوٹ شدہ آئین کہتا ہوں۔ اب اٹھارویں ترمیم کے بعد 4740 دن ہوتے ہیں۔ بہار کے موسم میں اٹھارویں ترمیم آئی۔ تو اگر آپ نے دیکھنا ہو کہ ہماری قومی زندگی اور جمہوری زندگی میں خزاں کیوں ہے تو ان دنوں کا شمار کیجیے گا۔ 16 فیصد اس کی عمر ضیا صاحب کی نیند میں بنتی ہے۔ سات فیصد مشرف صاحب کی نیند میں بنتی ہے، 21 فیصد جب یہ لڑکھڑاتا ہوا تھا اوپر یونیفارم تھا۔ اور 22 فیصد بے نظیر صاحبہ اور نواز شریف کے دور میں بنتی ہے۔ اور 26 فیصد اسی دستور کے اندر بنتی ہے۔ اس کا نقصان کیا ہوا؟ اس کا نقصان یہ ہوا کہ 26 کروڑ کے ملک میں تو سات

آٹھ فیصد لوگ یونیورسٹی، کالج جاتے ہیں، انہوں نے بھی دستور نہیں پڑھا، اسی وجہ سے نہ تو دستوری کلچر ہوگا نہ دستوری مزاج ہوگا، نہ دستوری تفہیم ہوگی۔ سیاست اور جمہوریت میں، میں نے سیاسی تقریر کی ہے۔

آئین کے مطابق معاشی حقوق

آئین کے اندر معاشی حقوق بھی ہیں، یہ وہ پرندہ ہے جس کے دو پر ہیں، ایک ہے سیاسی اور ایک ہے معاشی۔ 73 کے آئین میں پہلی بار کہا کہ اگر گیس، تیل نکل آیا ہے، اور بجلی بنالی ہے تو پہلا حق عوام کا ہے۔ سوئی گیس 50 کی دہائی میں نکلی اور 80 کی دہائی میں کوئٹہ پہنچی۔ آئین کہتا ہے عوام کا وسائل پہ پہلا حق ہونا چاہیے۔ پاکستان میں سستی مہنگی بجلی کو ملا کے ہر جگہ مہنگے داموں بیچتے ہیں۔ اٹھارویں ترمیم نے تو یہ کہا کہ تیل گیس کے اوپر جوائنٹ اینڈ ایکول اونر شپ (Joint and equal ownership), ہوگی۔ لیکن وفاق یہ دینا نہیں چاہتا۔ اب آپ ملک کو مرکز سے چلانا چاہتے ہو جیسے نہرو رپورٹ میں لکھا ہوا ہے، قائد اعظم ایسا پاکستان نہیں چاہتے تھے، کیونکہ صوبے کسی اور ملک کے تو نہیں ہیں۔ یہ جو جی ایس ٹی اینڈ سروسز (GST and Services) یہ 1947 میں بھی صوبوں کا ٹیکس تھا، صوبے اکھٹا کرتے تھے لیکن کیونکہ ایک نئی ریاست آئی جس کے مالی بحران تھے، جس کے لیے گاندھی صاحب جدوجہد کر رہے تھے، سب کچھ تو صوبوں نے کہا ملک چلانا ہے اور آزمائش ہے۔

ماضی کے سارے تجزیہ نگار کہتے تھے کہ پاکستان معاشی طور پر ہی مستحکم نہیں ہو سکے گا۔ اب پاکستان پانچواں بڑا ملک ہے اور انفراسٹرکچر کے اعتبار سے دنیا کے کئی ملکوں سے بہتر

ہے۔ بعض چیزوں میں کمی کوتاہی بھی ہو گی لیکن ساؤتھ ایشیا کی پہلی موٹر وے یہاں بنی اور کئی چیزیں ہیں، لیکن میں ہزاروں کوتاہیاں بھی گنوا سکتا ہوں، جس کی وجہ سے ہماری زندگیوں میں مسائل ہیں۔

معاشی پالیسیوں میں صوبوں کی شراکت اور چیلنجز

وفاقی حکومت کا دعویٰ ہے کہ وہ پہلے فنڈز اکٹھا اور تقسیم کر چکی ہے، تو اب آپ کیوں پریشان ہوں؟ وصولی کی آڑ میں حکومت اب صوبوں سے پانچ فیصد فیس مانگ رہی ہے۔ پنجاب نے انکار کر دیا اور اپنی ریونیو اتھارٹی قائم کی، جس سے ایف بی آرFBR نے وصولی چار جز کو پانچ فیصد سے کم کر کے ایک فیصد کر دیا۔ اس فیصلے سے 4 فیصد فائدہ ہوتا ہے۔ سندھ نے اس کی پیروی کرتے ہوئے دوسری پوزیشن حاصل کی، جب کہ خیبر پختونخوا کا صوبہ تیسرا اور بلوچستان چوتھے نمبر پر ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بیوروکریٹس ملک کو کس طرح چلا رہے ہیں۔ پنجاب کا آزادانہ ریونیو کلیکشن (Revenue Collection)اب 110 بلین ہو گیا ہے، جو کہ وفاقی نظام کے تحت 10 بلین کے مقابلے میں نمایاں اضافہ ہے۔ اگر آپ صوبوں کو موقع دیں تو وہ اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔ خیبر پختونخوا میں تعلیم اور صحت کے شعبوں میں سرمایہ کاری بڑھی ہے، جو ترقی کی علامت ہے۔ تاہم جب سیاست نے این ایف سی میں خیبر پختونخوا کا فیصلہ کرتی ہے ایک فیصد کیپ مختص کر کے اس صوبے کو دیں کیونکہ جنگ اور دہشت گردی کی وجہ سے اہم چیلنجز کا سامنا کرنا پڑا، فاٹا کے بجٹ میں تین فیصد کٹوتی کا سامنا کر رہی ہے۔ اب فکر کی بات ہے کہ چونکہ خیبر پختونخواہ وہ لاگت برداشت

کرتا ہے جو اسلام آباد فاٹا کے لیے کرتا تھا، اس لیے اس کا حصہ بڑھنا چاہیے۔ ٹیکس سے جی ڈی پی GDP کا تناسب، جو فی الحال نو فیصد ہے، ایک اہم اقدام ہے، جس کا ہدف پانچ سالوں میں اسے 13 فیصد تک بڑھانا ہے۔ اگر وفاقی حکومت کے پاس کافی وسائل ہیں تو اسے بیوروکریٹک رکاوٹوں سے بالاتر ہو کر حل تلاش کرنے چاہئیں۔

عطااللہ شاہ بخاری کا شکوہ

اب مجھے نہیں معلوم کہ شہری اور جمہوری تعلیم اداروں میں ہونی چاہیے کہ نہیں۔ لیکن مجھے یہ بتانے کی اجازت دیں کہ ایک انسان سے جمہوریت کیسے چلتی ہے، عطااللہ شاہ بخاری کہتے تھے یہ مسلمان بڑے ظالم ہیں، تقریر میری سنتے ہیں، بات ڈپٹی کمشنر کی مانتے ہیں اور ووٹ مسلم لیگ کو دیتے ہیں، 1985 کے بعد سے یہ مسائل رہے ہیں۔ محدود وسائل کے باوجود مفتی عبدالشکور اور مولانا نعمت اللہ جیسے افراد سیاسی طور پر نمایاں ہوئے ہیں۔ تاہم انتخابات سے کنارہ کشی کا رجحان برقرار ہے اور جمہوری عمل کو دولت کے کھیل میں تبدیل کر رہا ہے۔

مزدوری سے پارلیمنٹ کے ایوان تک کا واقعہ

پاکستان کے پہلے انتخابات لاہور میں ہوئے، ریلوے اسٹیشن پہ ایک مزدور رہنما ان کا نام مرزا ابراہیم تھا، جو قلی کی نوکری کیا کرتے تھے۔ انھوں نے لاہور سے الیکشن لڑنے کا فیصلہ کیا اور فیض احمد فیض نے، مزدور یونین نے ان کا ساتھ دیا۔ ان کا مقابلہ احمد سعید کرمانی صاحب بڑی مشہور خاتون کے بیٹے سے تھا الیکشن ہوا پہلی گنتی میں وہ جیت گئے،

دوسری گنتی میں ان کی جیت کم ہو گئی اور تیسری میں دوسرے جیت گئے۔ انتخابات کے حوالے سے یہ شکوک و شبہات 1954 میں اس وقت بھی جاری رہے جب نور الامین وزیر اعلیٰ تھے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے ایک طالب علم عبدالخالق نے ان کے خلاف مقابلہ کرنے کی ہمت کی اور جیت گئے، کیونکہ اس کہ مطابق ان کے حقوق کی صحیح ترجمانی نہیں کر پا رہے تھے، یہی انتخابی عمل میں حصہ لینے میں بہت سے لوگوں کی ہچکچاہٹ کو ظاہر کرتا ہے۔ اس لیے تو پھر ہم الیکشن سے بھاگتے تھے۔ ہم اس وجہ سے الیکشن سے دور ہوتے گئے کہ بھٹو صاحب کے دور میں قصور کا حلقے میں بہت امیر خاندان کے مقابلے میں مزدور نے الیکشن لڑا۔ اس کو مار پیٹ کر گنڈا سنگھ والے بارڈر پہ پھینک آئے۔ جب اسے ہوش آیا تو چلتا پھرتا چوگلی والے کے پاس پہنچا، اور کہا کہ آپ کے پاس ریڈیو ہے کیونکہ اس وقت ٹی وی اور موبائل فون نہیں ہوا کرتے تھے۔ اور کوئی دو گھنٹے کے بعد اٹھ کے ناچنا شروع کر دیا، کس نے پوچھا کیا ہوا، اس نے کہا کہ یہ جو ریڈیو پہ بندہ جیت رہا ہے وہ میں ہوں۔

ایک طالبعلم ڈاکٹر عبدلحیی بلوچ نے قلات کے خان کو ہرایا۔ مبشر حسن صاحب نے کہا کہ میں نے تین سو روپیہ خرچ کیا اور لاہور سے ایم این اے بنا، اور ڈھیروں مثالیں ہیں۔ آئین بنانا، قانون بنانا، قومی اسمبلی میں فیصلے کرنا، لکھنے پڑھنے کا کام ہے۔ جس دن ہم نے اس آئین کے مطابق قومی اور صوبائی اسمبلیاں چلانا شروع کر دیں تو ذوق ٹھیکے داری والے سب لوکل گورنمنٹ میں ہوں گے۔ کیونکہ وہاں سب اختیار ہوتے ہیں۔ تین چار کیس سٹڈیز انسانی بدن کی جمہوریت کے بارے میں، میں آپ کو یہ بتاؤں کہ میٹافر Metaphor میں اس کی کیا مثال ہے، ہم سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ فرض

کریں انسان کے سب سے زیادہ کام دماغ سے چلتا ہے اگر دماغ ماؤف ہو جائے تو انسان مفلوج ہو جاتا ہے۔ اسی طرح پارلیمنٹ بھی دماغ ہے اس نے سوچنا ہے، ملک کا نظام کیا ہو گا، ملک کا جھنڈا کیا ہو گا، آئین کیا ہو گا، ملک کا قانون کیا ہو گا۔ ہمارے 75 سالوں میں سے 28 فیصد ہماری قومی زندگی کا عرصہ بغیر پارلیمنٹ کے گزرا ہے، اب جس قوم کا 75 سالوں میں سے 28 فیصد وقت ذہنی طور پر ماؤف ہو تو ملک مفلوج نہیں ہو گا تو کیا ہو گا۔

جمہوریت اور ریاستی اداروں کی حرکیات

ریاست کے فریم ورک میں، ڈی سی، ایس پی، تھانیدار، تحصیلدار، اور استاد جیسے افراد ریاست کے ہاتھ پاؤں کے طور پر کام کرتے ہیں-اجتماعی طور پر یہ ریاستی ایگزیکٹو کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ ذہین ان لوگوں کو کہتے ہے جو قوانین بناتے ہیں اور امن و امان برقرار رکھتے ہیں، اسمبلی میں کام کرتے ہیں، جہاں قوانین بنائے جاتے ہیں، اور بجٹ سمیت وسائل مختص کیے جاتے ہیں۔

ریاست کا مدافعتی نظام

یکساں طور پر، عدلیہ ریاست کے مدافعتی نظام کے طور پر کام کرتی ہے، اس بات کو یقینی بناتی ہے کہ ہر حصہ ہم آہنگی سے کام کرے۔ جس طرح مدافعتی نظام میں عدم توازن خود بخود مدافعتی مسائل کا باعث بن سکتا ہے، اسی طرح ریاستی مشینری کا ایک خراب حصہ پورے نظام کو متاثر کر سکتا ہے۔ یہ باہمی ربط متوازن اداروں کی ضرورت پر زور دیتا ہے، جس میں دفاع، تعلیم، صحت اور مذہبی آزادی شامل ہے، جو جمہوریت اور

انتخابات کی چھتری کے نیچے متحد ہیں۔ جمہوریت، دل کی طرح، مسلسل نگرانی اور جوان ہونے کی ضرورت ہے۔ اگر عدم اطمینان پیدا ہوتا ہے، تو نئے رہنماؤں کی شکل میں 'ٹرانسفیوژن (transfusion)' اس کا علاج ہو سکتا ہے۔ 18ویں ترمیم کے بعد سے انتخابات کے متواتر ہونے سے شہری اقتدار کی منتقلی کو یقینی بنایا گیا ہے، جس سے مناسب اتفاق رائے کے بغیر ہنگامی اقدامات کے نفاذ کو روکا گیا ہے۔ جمہوریت کے دائرے میں، ہر نسل کو مثبت اور منفی دونوں نتائج کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے اپنے راستے پر چلنا چاہیے۔ یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ نظام کام جاری ہے، آئین بدلتے ہوئے حالات اور ضروریات کی بنیاد پر ترامیم کی اجازت دیتا ہے۔ مناسب عمل کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے، کسی بھی آئین میں اہم تبدیلی کے لیے دونوں ایوانوں میں دو تہائی اکثریت کی ضرورت ہوتی ہے، جو ایک محتاط اور قابل غور نقطہ نظر کو یقینی بناتی ہے۔ جمہوریت کی لچک اور موافقت اس کی برداشت اور قوم کی ابھرتی ہوئی ضروریات کو پورا کرنے کی صلاحیت کا ثبوت ہے۔

سوالات وجواب:

سوال نمبر1: کیاہم ایسے دور میں واپس جاسکتے ہیں جہاں انتخابی عمل پیسے سے نہیں چلتا، عام افراد کو اہم مالی وسائل کی ضرورت کے بغیر الیکشن لڑنے کے قابل بناتے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو اس کے حصول کے لیے ممکنہ عمل یا طریقہ کار کیا ہوگا؟

جواب: انتخابی اخراجات کے تناظر میں، یہ بات قابل ذکر ہے کہ امریکی صدارتی انتخابات عالمی سطح پر سب سے مہنگے کے طور پر مشہور ہیں، جو سیاست میں پیسے کے وسیع اثر کو ظاہر کرتے ہیں۔ ٹرمپ کی کامیابی، کافی حد تک ان کی فنڈ ریزینگ Fund Raising کی صلاحیتوں سے منسوب تھی، جو امریکی انتخابات میں مالی وسائل کی مرکزیت کی مثال ہے۔ کچھ ممالک نے ان مسائل کو حل کرنے کے لیے تبدیلیاں شروع کیں۔ پاکستان میں، ایم این اے کی نشست کے لیے قانونی اخراجات کی حد 40 لاکھ مقرر کی گئی ہے، جس میں تقریباً 250 سے 300 پولنگ اسٹیشن شامل ہیں۔ تاہم پانچ لاکھ ووٹرز والے حلقے کے لیے آٹھ روپے کے خط جیسے بنیادی رابطے کی لاگت پر غور کرتے وقت عملی چیلنجز پیدا ہوتے ہیں۔

تقابلی طور پر، برطانیہ، ایک چھوٹے زمینی رقبے اور آبادی کے ساتھ، زیادہ مقامی طرز عمل کو نافذ کر چکا ہے۔ حلقے کا حجم تقریباً 75 ہزار تک محدود ہے، جس سے زیادہ براہ راست نمائندگی کو فروغ ملے گا۔ تاہم زیادہ انتخابی اخراجات کا منفی پہلو خواتین کی کم نمائندگی ہے، اور موجودہ مساجد کے نیٹ ورکس سے مستفید ہونے والے علماء کو ایک

فطری فائدہ ہے۔ نتیجتاً، سیاست میں پیسے کی ضرورت سے زیادہ شمولیت کو روکنے کی کوششیں زیادہ جامع اور نمائندہ انتخابی نظام کا باعث بن سکتی ہیں۔

سوال نمبر 2: بنگال کے ساتھ خیبر پختون خواہ میں بھی ریفرنڈم کیوں کرایا گیا جس میں پنجاب اور سندھ کے لوگوں نے بھی ووٹ دیا لیکن خیبر پختون خواہ اسمبلی کو شرکت کی اجازت نہیں دی گئی؟ کیا جمہوریت کو بڑھانے کے متبادل طریقے یا ذرائع ہیں؟

جواب: پختون علاقوں میں ریفرنڈم ریڈ کلف ایوارڈ میں بھارت کو کشمیر کے ساتھ جوڑنے کے لیے ریاستوں کو ضلعوں اور تحصیلوں کے ذریعے جوڑنے کے اصول کی بنیاد پر کرایا گیا۔ خاص طور پر، آبادی کی مذہبی وابستگی خود بخود حکمران کے عقیدے سے مطابقت نہیں رکھتی تھی، جیسا کہ حیدر آباد دکن میں دیکھا گیا، جہاں اکثریت ہندو تھی، لیکن حکمران مسلمان تھا، جس کی وجہ سے بدامنی پھیلی۔

صوبہ سیٹل کا اصول N.W.F.P ، موجودہ خیبر پختون خواہ جیسے علاقوں پر لاگو ہوتا ہے، جہاں صوبہ سیٹل کی اسمبلی کو فیصلے کرنا ہوتے تھے۔ عوامی نیشنل پارٹی جیسی جماعتوں کے اندر ہونے والی بات چیت نے آزادی کے سوال کو شامل کرنے کا مشورہ دیا۔ ہندوستان کے ساتھ کانگریس کی حکومت کی صف بندی کے پیش نظر، ریفرنڈم اہم بن گیا۔ پختون اپنے جغرافیائی محل وقوع کی وجہ سے ہندوستان میں شامل نہیں ہو سکے، جس کی وجہ سے سہلٹ Sylhet اور آسام میں ریفرنڈم کرایا گیا، جہاں اکثریت مسلمان تھی، یہ ایک عملی حل تھا۔

مدرسہ اصلاحات اور پاکستان کو درپیش چیلنجز اور مواقع

میجر جنرل (ر) غلام قمر

میجر جنرل غلام قمر ڈائریکٹوریٹ برائے مذہبی تعلیم کے ڈائریکٹر ہیں اور مدارس کے امور پردسترس رکھتے ہیں۔انہوں نے اس لیکچر میں برصغیر میں تعلیمی پس منظر کو بیان کیا ہے۔ اس کے ساتھ مذہبی تعلیم کے خصائص،مسائل اور مطلوبہ اصلاحات پر بات کی ہے۔اس کےعلاوہ وہ مدارس کے حوالے سے ریاستی کردار کو بھی زیربحث لائے ہیں۔ یہ لیکچر مذہبی تعلیم اور مسائل و اصلاحات کا تناظر جاننے کے لیے مفید ہے۔

میرا تعلیمی تخصص

میں نے 1982 میں فوج شمولیت اختیار کی اور 2017 میں بطور معلم کمانڈ اینڈ سٹاف کالج کوئٹہ، پاکستان ملٹری اکیڈمی اور نیشنل ڈیفنس یونیورسٹی اسلام آباد سے ریٹائر ہوا۔ میں نے U.K سے پی-ایچ-ڈی کی ہے جس کا عنوان تھا"انتہاپسندی اور ردانتہاپسندی میں پاکستان کے نظام تعلیم کا کردار "

"Role of Pakistan's education system and its contribution to radicalization and deradicalization of society".

یہ دنیا میں اب تک کی گئی اپنی نوعیت کی ایک ہی پی-ایچ-ڈی ہے۔ واحد پی-ایچ-ڈی جو ایک جنرل نے، بالخصوص انفینٹری (Infantry) فوجی افسر نے کی ہے۔ لہٰذا اسی خاصیت کی وجہ سے وفاقی وزارت تعلیم نے مدارس کی اصلاح کے لیے مجھے چنا ہے۔

مدارس کی اصلاح کے لیے مرحلہ وار جو اقدامات کیے گئے ہیں یہ ان کا مختصر سا پس منظر ہے۔ مختصراً یہ ہے کہ مدارس کی تعلیم کے مراحل کیا ہیں؟ ان کے پاکستان کے نوجوانوں پر کیا اثرات ہیں؟ اور اس میں کیا مشکلات درپیش ہیں؟ ہماری حکمت عملی، ڈائریکٹوریٹ (دفتر نظامت) کا تعارف اور اختتامیہ بتانے سے پہلے مختصراً کچھ پس منظر بیان کروں گا۔ کیونکہ ہم سب جانتے ہیں کہ آج کل کے زیادہ تر نوجوان اس بارے میں بالکل نہیں جانتے کہ مدارس کی تعلیم کیسے شروع ہوئی؟

برصغیر میں تعلیم کی تقسیم کا پس منظر:

آپ سب کو معلوم ہے کہ پوری مسلم دنیا میں جتنے بھی سائنسدان، فلسفی، مذہبی رہنما پیدا ہوئے یہ سب مدارس سے برصغیر میں تعلیم کی تقسیم کا پس حاصل کر کے پیدا ہوئے۔ کیونکہ اس وقت بیکن ہاؤس' یا 'لاہور گرامر سکول' وغیرہ نہیں تھے اور کیونکہ ہمارا رسمی اور فورمل نظام تعلیم نہیں تھا اور ماں کی گود کے بعد، مسجد اور منبر ہی اصل درسگاہ ہوتی تھی۔ اور انہوں نے خوبصورتی سے بہت سارے سائنسدان، طبیعیات دان، کیمیادان، فلسفہ دان، اور بہت سارے ماہر فلکیات پیدا کیے ہیں اور جنہوں نے آدھی دنیا پر حکومت کی ہے۔ برصغیر میں 1857 کے 'جنگ آزادی' کے بعد انگریزوں نے یہ محسوس کیا کہ ہماری مذہبی تعلیم کو رسمی تعلیم سے علیحدہ کر دیا جائے اور یہ مسلم دنیا میں کی جانے والی پہلی تقسیم تھی جس سے ہمارا معاشرہ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ ایک حصہ مولوی بن گیا اور دوسرے حصے کو سرسید لے کر الگ راستے پر لے کر چل پڑے کہ جس کو انگریزی نہیں آتی ہے اس کو کچھ بھی نہیں آتا۔ اس کے بعد جدید تعلیم مختلف طریقے

سے شروع ہوئی اور مدرسہ کی تعلیم الگ طریق سے شروع ہوئی اور یہ سلسلہ 1947 تک جاری رہا۔ 1947 میں پاکستان میں اتنے مدرسے نہیں تھے۔ ہم نے وراثت میں جو نظام تعلیم لیا وہ برطانیہ کے زیر اثر تھا۔ جس کو تھوڑی بہت انگریزی لکھنی اور پڑھنی آتی تھی اسی کو نوکری ملتی تھی۔ جو ہمارے علماء جو حضرات دینی تعلیم کے داعی تھے، وہ آہستہ آہستہ ایک طرف ہوتے گئے۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ ہم سب پاکستان میں مدارس کا پھیلاؤ اور تعداد میں اضافہ شروع ہوا۔ 70 کی دہائی کے آخر میں اس کا آغاز ہوا اور 80 کی دہائی میں 'افغان جہاد' کی وجہ سے ان کا فروغ عروج پر چلا گیا۔ ہمارے مدرسے بڑھتے چلے گئے کیونکہ ہم نے مجاہدین بنانے تھے۔ ہم ان کو دینی تعلیم بھی دیتے تھے اور جہاد بھی سکھاتے تھے لہٰذا یہ مدرسے آہستہ آہستہ بڑھتے گئے اور اتنے زیادہ بڑھ گئے کہ بعد میں ان کو قابو کرنا ہی مشکل ہو گیا۔ ایک فقہ نے کہا کہ ہمارا مدرسہ ہے تو دوسرے نے کہا ہمارا کیوں نہیں؟ اس نے بھی بنالیا۔ پھر تیسرے نے بھی بنالیا۔ پھر چوتھے نے بھی بنالیا اور پھر بڑھتے ہی گئے۔ اور پھر یہ 90 کی دہائی میں عروج پر پہنچ گئے۔ پھر 90 کی دہائی کے آخر میں یہ احساس ہوا کہ ان مدارس کو جدید بنایا جائے اور واپس اپنی بنیاد تعلیم کی طرف لے جایا جائے اور انہی میں سے ایک یا دو کو عام تعلیمی نظام میں شامل کیا جائے۔ 2001 میں جنرل پرویز مشرف نے 'مدرسہ تعلیمی بورڈ' اس عزم کے ساتھ بنایا کہ ہم انہیں رائج الوقت تعلیمی نظام میں شامل کریں اور یہاں بھی انگریزی، حساب اور سائنس پڑھائیں۔ لیکن حقیقت میں یہ تدبیر کارگر نہیں ہوئی کیوں کہ ایک طرف روشن خیال اعتدال پسندی کا نظریہ تھا جو کہ پاکستان میں رائج ہماری مذہبی اور ثقافتی حدود کی وجہ سے بہت زیادہ فروغ نہیں پا سکا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں کی اچھی طرح سے مالی امداد

اور دیکھ بھال نہیں کی گئی۔ وہ تین مدرسے جن میں سے ایک کراچی، سکھر اور اسلام آباد میں بنائے گئے جواب بند ہو چکے ہیں۔

پاکستان میں مدرسہ اصلاحات کا پس منظر:

- ڈائریکٹوریٹ جنرل برائے مذہبی تعلیم کا قیام

اے۔ پی۔ ایس (Army Public School) پشاور کے سانحے کے بعد جب ہم نے نیشنل ایکشن پلان بنایا تو اس میں محسوس کیا گیا کہ ہمارے مدرسے کے طلباء کو اچھی تعلیم نہیں ملتی ہے اور ان میں سے بہت سارے جہادی تنظیموں میں چلے جاتے ہیں لہذا ان کی اصلاح کی جائے اور برابری کے مواقع فراہم کیے جائیں۔ اسی وجہ سے اسے قومی ایکشن پلان 2018 کا حصہ بنا دیا گیا اور پھر تنظیم المدارس اور حکومت کے درمیان مدارس میں جدید تعلیم کو باقاعدہ بنانے کے لیے متعدد کانفرنسیں منعقد کی گئیں۔ چنانچہ اگست 2019 میں اتحاد تنظیم المدارس اور وزارت تعلیم کے درمیان ایک مفاہمتی دستاویز پر دستخط ہوئے کہ پاکستان کے تمام مدارس حکومت کے ساتھ رجسٹر کروائے جائیں گے اور حکومت انہیں جدید تعلیم کے لیے اساتذہ اور کتابیں فراہم کرے گی اور دیگر مہارتیں بھی سکھائی جائیں گی۔ اور پھر یہ ڈائریکٹوریٹ تشکیل دیا گیا- یہ وہ وقت تھا جب میں پی ایچ ڈی کے آخری مرحلے میں تھا اور میری ملاقات سابق وزیر تعلیم شفقت محمود سے ہوئی اور انہوں نے کہا کہ "جنرل صاحب! آپ جو کام کر رہے ہیں اس کام کے لیے ہمیں بندہ نہیں ملتا کیونکہ پاکستان میں کوئی انسان ایسا نہیں ہے جو مدارس میں اصلاحات کا اہل ہو اور آپ کی پی ایچ ڈی بنیادی طور پر اسی مسئلے کو حل کر رہی ہے لہذا

آپ یہ منصب سنبھال لیں"۔ اصل میں 2021 میں جب میں نے چارج لیا تو 500 مدارس ڈائریکٹوریٹ میں رجسٹرڈ تھے۔ مدارس کے پانچ مراحل ہیں اور اس میں لکھا ہے کہ جو 6 سے 8 سال میں پہلے حفظ کرواتے ہوں وہ آٹھویں کلاس کے ساتھ اس کو شامل کرتے ہیں اور اس میں ناظرہ قرآن پڑھایا جاتا ہے جو عربی میں ہے۔ پھر میٹرک سطح کی تعلیم ہے۔ ایف اے سطح کی تعلیم ہے، ماسٹر ڈگری ہے، ایم فل ہے، پی ایچ ڈی ہے، وہاں بہت کچھ ہے میں نے جن مدرسوں کا دورہ کیا وہاں دیکھا ہے کہ لوگوں نے یہ سارا کچھ کرنے کے ساتھ ساتھ انجینئرنگ بھی کی ہوئی ہے۔ تعلیم یافتہ ایم بی بی ایس ڈاکٹرز بھی ہیں۔ کمپیوٹر کے تعلیم یافتہ بھی ہیں۔ ماہرین بھی ہیں لیکن وہ آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ ہیں مگر بہت کم ہیں لیکن بنیادی طور پر مدرسہ کی تعلیم ایسے ہوتی ہے جسے آپ "درس نظامی" کہتے ہیں، یہ عربی میں ہے اور یہاں اور کوئی زبان نہیں ہے۔ جنہوں نے اپنے طور پر پڑھ لیا ہے تو وہ الگ بات ہے اور یہ ایک ملک بلکہ کسی بھی ملک کا جو تعلیمی نظام ہے، اس کے چند اجزاء ہیں اور یہ صرف ایک نصاب نہیں ہے۔

کسی بھی ملک کا تعلیمی نظام معاشرے کی اجتماعیت پر مبنی ہوتا ہے۔ اس میں غیر نصابی سرگرمیاں بھی شامل ہیں اور پھر اس کا مرکزی نصاب ہے۔ پھر اس میں اپنی شخصیت کی نشوونما اور نتائج کی ہم نصابی سرگرمیاں ہیں اور والدین یا سرپرست اس نظام تعلیم کے بہت اہم اجزاء ہیں اور ایک آخر میں ریاست کا نظریہ ہے کہ آپ حقیقت میں کس قسم کے نتائج چاہتے ہیں۔ اور حسب دستور ایک نکتہ جو میں ہمیشہ اپنی تمام کابینہ، کانفرنسوں میں بولتا ہوں کہ ہمیں کس قسم کے پاکستانی کی ضرورت ہے؟ آپ کیسی پی۔ ایچ۔ ڈی سکالر سے کیا چاہتے ہیں؟ آپ ایم فل ڈگری یافتہ فرد کے لیے کیا چاہتے تھے؟ جس نے

پاکستان میں بی اے کیا ہے آپ اسے کیسا پاکستانی بی اے پاس چاہتے ہیں؟ یا پھر وہ اچھا مسلمان ہو؟ اچھا انسان ہو؟ وہ ایک اچھا پاکستانی ہو؟ وہ ماحول کو سمجھتا ہو؟، دنیا کو سمجھتا ہو؟ کیا دین کو سمجھتا ہو؟ آپ کی ترجیحات کیا ہیں؟ بدقسمتی سے میں نے آج تک کوئی تحریری دستاویز نہیں دیکھی کہ ایک ناخواندہ اور پڑھے لکھے پاکستانی کا معیار بتا سکے۔ اگر آپ پورے نظام کو دیکھیں اور اگر آپ معاشرتی اثرات کو ہٹا دیے تو ایک چیز کم ہوتی ہے اور پھر اگر آپ اس میں سے تمام اجزاء کو آہستہ آہستہ نکال دیے تو یہ مدرسہ رہ جاتا ہے جس کا صرف ایک نصاب اور ایک اختتام ہے۔ نہ ہی اس میں والدین کا کوئی کردار ہے کیونکہ والدین اپنے بچوں کو مدرسہ بھیجتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ ہم نے اپنے بچوں کو مدرسے میں بھیجا ہے اور وہ نہ تو اس معاشرے کے ساتھ کھل کر بات کرتا ہے کیونکہ وہ سماجی اثرات سے متاثر نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ کسی غیر نصابی سرگرمیوں کو جانتا ہے۔ سال میں ایک دو بار صبح ایک گھنٹے کی ورزش کروا کر یا فٹ بال میچ کروا کر آپ اسے جسمانی طور پر چست نہیں کر سکتے ہیں. لہٰذا تعلیمی نظام میں ایسی بہت سی سرگرمیاں ہیں جن کا مدارس کے تعلیمی نظام میں فقدان ہے۔ اور اس کا اثر شخصیت کی نشوونما پر پڑتا ہے۔ جب آپ ریشم کے کیڑے کو اس کے خول میں ڈالتے ہیں اور اسے تیار کرتے ہیں تو وہ انڈے کے اندر بڑھتا ہے اور پھر جب وہ نکلتا ہے تو اسے دنیا بہت عجیب لگتی ہے۔ اس کو وہی نظر آتا ہے جو اسے دکھایا گیا ہے تو یہ ہمارے مدرسہ کی تعلیم کا مسئلہ بھی یہی ہے۔ کچھ مسائل میں نے اجاگر کیے ہیں۔ جدید مضامین مدرسہ نظام تعلیم میں شامل نہیں اور ان کو ابھی شامل کیا گیا ہے۔ تمام مدارس میں ابھی بھی جدید مضامین نہیں پڑھائے جاتے صرف درس نظامی پڑھایا جاتا ہے۔ تو جو جدید مضامین نہیں پڑھتے

ان کے شعور کی سطح نہیں بڑھتی- بات چیت کرنے کا ہنر نہین آتا مدرسے کے بچوں کو کیونکہ وہ عربی میں پڑھتے ہیں اور کوئی اردو نہیں جانتا تو کوئی انگریزی نہیں جانتا یا صرف پشتو یا عربی جانتا ہے- وہ لوگ عربی میں بہت اچھے ہیں لیکن دوسری زبانیں وہ نہیں جانتے-اس لیے ان کے مختلف مواقع پر اپنا نقطہ نظر بتانا ایک مسئلہ ہے۔ علم کا خزانہ آتا ہے مثلا "وٹس ایپ" کے ایک تعلیمی پیکج کی طرح-اگر علم کی بنیاد کمزور ہے تو ذیلی تعلیمی پیکج بھی کمزور ہو گا، پھر شخصیت سازی کا مسئلہ ہو گا- پھر ہنر نہیں ہیں۔ ہم "درس نظامی" پڑھاتے ہیں اور اس کے ساتھ جدید مضامین بھی پڑھائیں تو اگر کوئی بچہ میٹرک کے بعد کچھ نہیں کرنا چاہتا، اگر اس کے پاس کوئی مہارت نہیں ہے تو وہ معاشرے کے لیے کا آمد نہیں ہے-نہ اسے کوئی کلرک رکھتا ہے، نہ اسے کوئی کی نوکری دیتا ہے جو کہ وہ بھی آج کل سفارش سے ملتی ہے۔ درحقیقت مدارس کے طلبا کے لیے قبولیت کی کم شرح کی وجہ سے برابری کے مواقع کم ہیں اور اس لیے معاشرے میں انہیں قبول کرنے کی شرح کم ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ لوگ معاشرے کے ایک خاص طبقے سے آئے ہیں اور انہوں نے ایک خاص سطح کی تعلیم حاصل کی ہے-اس لیے وہ ہمارے لیے مناسب نہیں ہیں-اس حقیقت کے باوجود کہ ایچ-ای-سی ان کی ڈگریوں کی تصدیق کرتی ہے اور باوجود اس کے پھر بھی انہیں ملازمتوں کے حوالے سے مسائل ہیں اور آخر میں وہ مدارس سے فارغ التحصیل بچے کیا کرتے ہیں؟ ان سب کو جدید نظام تعلیم کے ذریعے کام کرنے کا موقع نہیں ملتا اور پھر اصل میں مایوسی جنم لیتی ہے اور درحقیقت یہ بہت مایوس کن بات ہے کیونکہ پھر وہ مایوسی انہیں انتہا پرستی اور پھر سماجی غیر اخلاقیات کی طرف لے جاتی ہے-میں افسوس کے ساتھ کہتا ہوں کہ اگر آپ مدرسے کے طالب علم

کو ایک مقصد نہیں دیتے ہیں اور ان کو طلباء کو معاشرے میں کشادہ دلی سے قبول نہیں کرتے، انہیں دوسرے لوگوں کے ساتھ گھلنے ملنے کر مواقع نہیں دیتے، اسی لیے یہ سماجی اخلاقیات ترقی نہیں کر پاتے-اور پھر آخری چیز احساس ہے، جو ریاست کی ملکیت ہے۔

- ریاست کی ذمہ داریاں اور دینی مدارس:

کسی بھی ریاست کی تین ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ سب سے پہلی اور سب سے زیادہ اہم تحفظ ہے- دوسری تعلیم ہے اور تیسری صحت ہے۔ بد قسمتی سے ریاست نے یہ تینوں ذمہ داریاں صوبائی سطح پر سونپ دی ہیں کہ نہ ہم تعلیم دیں گے اور نہ ہی صحت و سلامتی کی ذمہ داری اور جو پولیس ہے وہ بھی صوبائی حکومت فراہم کرے گی۔ مدارس یا تو خود اپنی کفالت کرتے ہیں یا غیر ملکی ایجنسیوں کی طرف سے انہیں امداد فراہم کی جاتی ہیں۔ لیکن ریاست کی طرف سے مدارس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔اس لیے مجموعی طور پر مدارس بے دخل کر دیا گیا ہے اور جو بھی تعلیمی اصلاحات ہوتی ہیں وہ مدارس تک پہنچتی ہی نہیں ہیں۔ ڈائریکٹوریٹ کی جانب سے یہ حکمت عملی تشکیل دی گئی، جس کی ہم نے پیروی کی ہے- وہ یہ کہ سب سے پہلے ہمیں مدارس کو قبول کرنے کی ضرورت ہے۔ ریاست کو مدارس کو قبول کرنے کی ضرورت ہے۔ قبولیت کنٹرول کی معنوں میں نہیں، بلکہ امداد فراہم کرنے اور پالیسی بنانے کے حوالے سے قبولیت ہے کہ وہ ہمارے بچے ہیں-وہ پاکستانی ہیں اور ہمیں ان کا متنظم بننے کی ضرورت ہے پھر ان کے لیے بنیادی تعلیم مہیا کرنا، باہنر بنانا، انہیں اساتذہ فراہم کرنا، جو انہیں جدید علوم سکھا سکیں۔اس کے بعد وہ اس قابل ضرور ہو جائیں گے کہ معاشرہ ان کو قبول کرنا شروع کر دے۔ مثال کے

طور پر اگر آپ ایک الیکٹریشن کو تربیت دیتے ہیں تو اگر اس کو سرکاری ملازمت نہیں بھی ملتی تو وہ اپنی دکان کھول سکتا ہے بجائے اس کے کہ وہ ایک نیا مدرسہ کھول لے یا کسی مسجد کا امام بن جائے۔ اس کو معاشرے میں مواقع دیں تاکہ وہ معاشرے کے نظام میں شامل ہو سکے اور خود کو معاشرے کی ترقی میں پیچھے محسوس نہ کرے اور یہ نہ سوچے کہ کسی نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ اب وہ مقاصد جو ہم نے ان کی اصلاحات کے ذریعے متعارف کرائے ہیں لیکن اصل مقصد تو وہی ہے کہ ہم انہیں معاون شہری کو طور پر تیار کرنا چاہتے ہیں- ہماری لیے ضروری ہے کہ مدارس کی یہ تعلیم پاکستان کے بنیادی تعلیمی نظام کی ترقی میں فعال ہونی چاہیے۔ مدارس کے نظام کو کنٹرول کرنا اور اس میں شامل ہونا ہمارا مقصد نہیں ہے اور نہ یہ ہونا چاہیے کیونکہ وہ ایک کام کر رہے ہیں یعنی دین کی خدمت کر رہے ہیں تو ان کو کرنے دیں اور اس کے ساتھ ساتھ ان میں جو خامیاں اور مسائل ہیں جن کی میں نے پہلے بھی نشاندہی کی ہے۔

- ڈائریکٹوریٹ جنرل برائے مذہبی تعلیم (DGRE) کے قیام کا مقصد-:

ڈی۔ جی۔ آر۔ ای (DGRE) کا بنیادی ہدف اور مقصد رکھا گیا ہے کہ دینی تعلیم کو فعال کریں- دینی مدارس کا اندراج کروایں تاکہ ان کو ہم اساتذہ اور کتابیں دے سکیں- ہم ان کی کوئی مالی مدد کر سکیں اور جو غیر ملکی پاکستان میں پڑھنے کے لیے آتے ہیں ان کو ویزہ حاصل کرنے میں بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان کو سہولیات مہیا کریں۔ آپ سمجھتے ہیں کہ وہ دہشت گرد بننے کے لیے آگئے ہیں لیکن ایسا کوئی مسئلہ نہیں - وہ دہشت گرد بننے کے لیے نہیں آتے، ان کو سہولیات دیں - ان کو آنے دیں تاکہ وہ پاکستان کا اچھا تاثر لے کر باہر جائیں گے کیوں کہ پاکستان اسلام کا قلعہ ہے اور یہاں دین

کی تعلیم دی جاتی ہے۔ مدارس کو ہم نے مختلف تعلیمی بورڈز کے ساتھ الحاق کروایا ہے جس میں طالب علم میٹرک کا امتحان دے سکیں- ایف اے، ایف ایس سی کا امتحان دے سکیں-بی اے کر سکیں اور بعد میں یونیورسٹیوں میں بھی جا سکیں۔ لہذا انہیں ایم ڈیکیٹ (MDCAT) کا امتحان دینے کا موقع ملے اور وہ ڈاکٹر اور انجینئر یا پھر فزیوتھراپسٹ بھی بن سکتے ہیں- جو وہ بننا چاہتے ہیں بن سکتے ہیں- یہ ہمارا منشور ہے۔ جو ویزا کے بارے میں میں نے بات کی تو کچھ لوگوں کو یہ شک تھا جی کہ بیرونی امداد بہت زیادہ ہو رہی ہے تو ہو رہی ہے، اگر تو باہر سے ان کو پیسے مل رہے ہیں تو آپ ان کے اکاؤنٹس کھول لیں آپ کو پیسہ آنے کا خود بخود پتہ چلتا رہے گا۔ ان کے پیچھے سکیورٹی اداروں کو لگانے کی ضرورت نہیں ہے- بس پاکستان کے منتخب بینکوں میں ان کے اکاؤنٹس کھولیں اور پھر وہ کس کو پیسے دیتے یا لیتے ہیں؟ آپ کے پاس ریکارڈ ہو گا اور پھر وہ پیسے جو ان طلبہ کی تعلیم پر خرچ کیے جا رہے ہیں، حکومت رقم دینے کے قابل نہیں ہے تو پھر کسی اور کو یہ کام کرنے دیں۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ سب پاکستان کے خیر خوہ نہیں۔ بہت سارے ایسے لوگ بھی ہیں جن کے پاس پیسہ ہے اور وہ اسے اچھے مقصد کے لیے خرچ کرنا چاہتے ہیں۔

یہ تنظیم ہم نے بنائی ہے اور میں خود گریڈ 22 میں پروجیکٹ ڈائریکٹر ہوں اور پھر میرے ساتھ آئی ٹی (I.T) سیکشن ہے۔ ہمیں اسے بنائے ہوئے چھ ماہ ہو چکے ہیں۔ پہلے تو آئی ٹی (I.T) کا نام تک نہیں تھا- پھر تین ڈائریکٹر ہیں- ایک انتظامی دیکھ بھال کر رہا ہے- پھر ڈائریکٹر رجسٹریشن، پھر ایک مالیات کا خیال رکھتا ہے۔ اس کے پورے پاکستان میں 60 دفاتر ہیں- بڑے شہروں میں صوبائی ہیڈ کوارٹر ہیں جو 132 اضلاع کو سنبھال رہے ہیں۔

ڈائریکٹرز اور اسسٹنٹ ڈائریکٹرز براہ راست مدارس جاتے ہیں اور ان سے ملتے ہیں اور ان کے مسائل حل کرتے ہیں اور ان کا اندراج کرواتے ہیں جس کے بارے میں انہوں نے پہلے بات کی تھی۔ ہمارے علاقائی دفاتر راولپنڈی، ملتان، سکھر، حیدر آباد، ڈی آئی خان، سوات، خضدار، لورالائی، میرپور، سکردو اور مزید کچھ اضلاع میں ہیں۔ وہ ملک میں ان اضلاع کا انتظام سنبھالتے ہیں۔ اس لیے جہاں تک اصلاحات متعارف کرانے کا تعلق ہے تو ملک بھر میں ان کا نفاذ جاری ہے۔ 15 وفاق ہیں جن میں سے پانچ کا تعلق مدارس کے اتحاد تنظیم المدارس سے تھا اور 10 وفاق ہم نے بعد میں بنائے- کل 10 وفاق ہیں جن کے ذریعے ہم مدارس کے ساتھ بات چیت کرتے ہیں۔ میں یہاں واضح کرنا چاہوں گا کہ یہ اتنے وفاق ہم نے کیوں بنائے ہیں؟ معذرت کہ میں ایک غلط لفظ استعمال کر رہا ہوں ایک (Monopoly) اجارہ داری تھی اور اس میں کسی کو شامل نہیں ہونے دیتے تھے اور ہمیں ان کو سہولیات مہیا کرنے میں دشواری کا سامنا تھا کیونکہ اس تنظیم میں شامل ہونا مشکل ہوتا ہے جو ہمیں قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے-اس لیے مختلف شعبوں میں ہم نے 15 وفاق بنائے تاکہ ہم ان سے آزادانہ طور پر بات چیت کر سکیں۔ اور ان کے تحت جو مدارس رجسٹرڈ ہیں ہم ان مدارس کے ساتھ براہ راست رابطہ نہیں کرتے بلکہ ہم وفاق کے ذریعے سے کرتے ہیں کیونکہ ایک یہ مسئلہ ہے کہ جب ہم وفاق کو ایک طرف کر کے رابطہ کرتے ہیں تو جو وفاق کے منتظمین کو یہ اعتراض ہوتا ہے کہ یہ ہمارے دائرہ اختیار میں آکر دخل اندازی کر رہے ہیں۔

- ڈائریکوریٹ کے ساتھ رجسٹر شدہ مدارس کی تعداد-:

مثال کے طور پر جب میں ڈی-جی منتخب ہوا تو بہت زیادہ مضمون لکھے جانے لگے-ٹویٹر آ گیا کہ جنرل آ گیا ہے اور مدرسوں پہ قبضہ کرنے کے لیے فوج آ گئی ہے اور میری وردی والی ایک تصویر لگائی ہوتی تھی۔ پھر میرے ایک اچھے دوست ہیں، انھوں نے کہا کہ آپ اس کا کچھ حل نکالیں اور ان کو بتائیں کہ آپ پی ایچ ڈی ڈاکٹر ہیں اور وہ جرنیلی کا دور تو ختم ہو گیا ہے-اب تو نیا باب شروع ہو گیا ہے اور آپ ایک ماہر تعلیم اور ایک معلم بن کے ان خدمات کو سرانجام دینا چاہتے ہیں-تو لوگوں کو یہ سمجھانا مشکل تھا کہ ان کی اور ان کے بچوں کی بہتری کے لیے یہ سارا نظام وضع کیا گیا ہے- بہر حال پھر آہستہ آہستہ انہوں نے قبول کر لیا تو ابھی ہمارے پاس 15 وفاق ہیں اور کچھ کثیر ڈگری کے حامل ادارے ہیں-نو کے قریب جو وفاق تو نہیں ہے لیکن یہ خود بی اے، ایم اے اور اس سے بھی آگے کی ڈگری جاری کرتے ہیں۔اب تک ہمارے پاس حکومتی سروے کے مطابق 32 ہزار اور میری تحقیق کے مطابق 40 ہزار سے زاید مدارس ایسے ہیں جو حکومت کے پاس رجسٹرڈ ہیں یا جن کی دستاویزات جاری کی گئی ہیں-یعنی تقریباً 32 ہزار ہیں جس میں سے 15 ہزار ایک سو ہمارے ساتھ رجسٹر ہو چکے ہیں۔ صرف دو سال کے عرصے میں ہم تقریباً نصف سے زیادہ سنگ میل عبور کر چکے ہیں یہ ہماری کامیابی ہے کہ مدارس اب رجسٹرڈ ہو چکے ہیں۔

رجسٹر شدہ مدارس کو کیا فوائد حاصل ہیں؟

وہ مدارس جو رجسٹر شدہ ہیں، ان کو کیا فوائد حاصل ہو رہے ہیں؟ مثال کے طور پر بلوچستان کے دارالحکومت کوئٹہ میں ایک بم دھماکہ ہو گیا اس کے بعد پولیس ہر مدرسے میں پھر رہی ہے اور کئی لوگوں کو پتہ ہی نہیں ہے کہ مدرسے کدھر ہیں اور اگر دیکھا جائے تو اس ملک میں بہت ساری عوام رہتی ہے صرف مدرسوں میں ہی آپ کو دہشت گرد نظر آتے ہیں؟ وہ دہشت گرد جو گلبرگ لاہور کے اندر رہ رہے ہیں، لاہور کینٹ کے اندر وہ دو دو کنال کا گھر لے کے رہ رہے ہیں ان کی بھی جا کے نگرانی کرو۔ تو جب مدارس ہمارے پاس رجسٹر ہو گئے اور ہمارے پاس اعداد و شمار جمع ہو جاتے ہیں تو ہم ان اداروں کو بتا دیتے ہیں کہ اس مدرسہ کے پاس اتنے بچے ہیں۔ یہ لوگ ان کے متہم ہیں۔ یہ ان کا مقام ہے اور ان کے نگرانی ہو رہی ہے اور ان سے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اور پھر بھی اگر آپ کو کوئی شک ہے تو آپ کسی اور جگہ پہ جا کے ڈھونڈیں۔ ہر روز کسی ادارے کا یا کسی اور کا مدرسے میں گھس جانا, اور ان کو پوچھ تاچھ کرنا کہ آپ کی فیملی کیا کرتی ہے؟ آپ کا بھائی کیا کرتا ہے؟ آپ کے والد صاحب کیا کرتے ہیں؟ ہر روز ان کی جو چھان بین ہو رہی ہوتی تھی تو ابھی وہ ختم ہو گئی ہے۔ ہمارے پاس وسیع اعداد و شمار ہیں جن کا ہم نیشنل ایکشن پلان کے ساتھ اشتراک کرتے ہیں۔ ہم نیکٹا سے بات کرتے ہیں اور انہیں بتاتے ہیں کہ یہ مدارس ٹھیک ہیں، اور ہمارے ساتھ رجسٹرد شدہ ہیں۔ ان کو آپ نہیں چھیڑیں ہم ان سے رابطے میں ہیں۔ آپ ان جگہوں پر کام کریں جہاں کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے پاس پورے پاکستان سے 15120 مدارس ڈی جی ار ای 'DGRE کے ساتھ رجسٹر شدہ ہیں اور ہم نے ابھی 1196 اساتذہ ان مدرسوں میں

مہیا کر دیئے ہیں جو کہ ان بچوں کو جنرل سائنس، ریاضی اور انگریزی پڑھاتے ہیں ایسے بچوں کو جنہوں نے آگے ایف اے، ایف ایس سی کرنا ہے اور جو امتحان میں حصہ لیں گے، بہت سارے بچے امتحان میں شامل ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ اس سال بھی تقریبا 4000 طلبا بورڈ کے امتحان میں شامل ہوں گے۔ ہم ان کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں کہ وہ ایف جی (Federal Board) کے ساتھ آپ اپنے آپ کو رجسٹر کر لیں اور ایف اے، ایف ایس سی، بی اے، بی ایس سی کریں اور معاشرے کا کارآمد رکن بنیں۔ 56 ہزار 7 سو 10 طلباء کو قومی نصاب کی کتابیں مفت فراہم کی گئی ہیں۔ میں قومی نصابی کونسل کا بھی ممبر ہوں۔ ہم نے جو نصاب قومی سطح پر منتخب کیا ہے یہ اس نصاب کی کتابیں ہیں جو ہم مفت مہیا کر رہے ہیں۔ ہم جو اساتذہ مہیا کر رہے ہیں ان کو تنخواہ حکومت پاکستان دے رہی ہے اور وفاقی وزارت تعلیم جو کتب دے رہی ہے وہ بھی ہم خود چھاپ کر نیشنل بک فاؤنڈیشن کے ذریعے مدارس کو مفت دے رہے ہیں۔ 70 مدرسے ہم نے ابھی تک رجسٹر کر لیے ہیں جن کو نئے آنے والے بجٹ میں اگر ہمیں کوئی مالی امداد مل جاتی ہے تو ہم ہر صوبے میں، ہر مسلک کے مدرسے میں ووکیشنل ٹریننگ کا شعبہ بنا رہے ہیں، تاکہ کسی کے ساتھ بھی زیادتی نہ ہو۔ کوئی بھی نظرانداز نہ رہے اور وہاں پر ہم کمپیوٹر کی لیبارٹریاں بھی بنا رہے ہیں۔ الیکٹریشن کا کورس، ترکھان کا کورس، ڈرائیونگ کی کلاسز چلائیں گے—تاکہ جو لوگ وہاں سے سند یافتہ ہونے کے بعد آگے پڑھنا نہیں چاہتے ان مدرسے کے طلبا کو ہنرمند بنایا جاسکے۔ انہیں نیوٹیک (NAVTTC) کی سند دی جائے تاکہ سول میں ملازمت بھی لینا چاہیں تو بطور ماہر کاریگر کام کر سکیں۔ ملک سے باہر جانا چاہیں تو تصدیق شدہ مزدور کے طور پر جا سکتے ہیں۔

یہ ہماری کچھ شراکت ہے۔ ہم نے کوئی 1100 طلبا کو پاکستانی ویزا فراہم کیا ہے- جو بیرون ملک سے آکر پڑھنا چاہتے ہیں پہلے ان کو آئی ایس آئی سے اجازت بہت مشکل ملتی تھی، یا بالکل ہی نہیں ملتی تھی- چھ چھ مہینے ان کے سرٹیفکیٹ پڑے رہتے تھے- بچے پڑھنا چاہتے تھے اور دینی تعلیم حاصل کرنا کے لیے باہر کے ملکوں سے آنا چاہتے تھے اور ادھر آکر ہم روک دیتے تھے کہ یہ امریکہ سے آرہا ہے تو ہم اس کو کیوں داخل کریں تو کیونکہ اب ہم نے طریقہ کار طے کر لیا ہے تو ان کی نگرانی بھی ٹھیک ہو جاتی ہے اور ان کی تعلیم بھی ٹھیک طریقے سے ہو جاتی ہے۔

پیغام پاکستان پر تقاریب کا اہتمام-:

پیغام پاکستان میں ہم ایک بہت بڑی تقریب کا اہتمام کرتے ہیں جس میں بنیادی طور پر قومی یکجہتی پر بات کرتے ہیں کہ پاکستان کے اندر بہت سارے مذاہب اور مسالک ہیں- ہم نے ان سب کی عزت کرنی ہے، پاکستان میں سب مذاہب ہیں، ہندومت بھی ہے، عیسائی بھی ہیں- تو ان سب کو ہم بلاتے ہیں اور ایک پیغام پاکستان کا جو منبر ہے اس کے اوپر میں خود بھی بولتا ہوں اور جتنے لوگ آئے ہوتے ہیں ان سب کو بھی تقریر کا موقع دیتے ہیں تو اتحاد قائم ہوتا ہے-اکٹھے چائے پی لیتے ہیں-اس میں سارے مسلک کے لوگ بھی آ جاتے ہیں شیعہ، سنی،اہل حدیث، بریلوی، دیوبندی سارے آجاتے ہیں۔ایک تقریب کراچی میں ہوااور حالیہ دنوں میں ہم نے ایک تقریب لاہور میں بھی منعقد کی ہے-۔یہ تقریبات ہم نے گزشتہ دو تین مہینے کے اندر منعقد کی ہیں۔ ہم لوگ پشاور، مظفر آباد گئے اور اسلام آباد میں ایک تقریب کی۔ طلبا کے درمیان قومی اتحاد کے

موضوع پر تقریری مقابلے کرائے جاتے ہیں۔ ہماری آزادی ہے اس کا تحفظ ہمیں کیسے کرنا چاہیے؟ ہمارے درمیان میں فرقہ بندی ہے اس کو کیسے ختم کیا جاسکتا ہے؟ یا کم کیا جا سکتا ہے؟ کھیلوں کی تقریبات ہوتی ہیں۔ حال ہی میں کراچی میں ایک بین المدارس کرکٹ میچ منعقد کروایا ہے جس میں وزیراعلی سندھ نے بھی حصہ لیا تھا۔ سول سوسائٹی کے لوگ بھی آئے۔ ابھی ہم نے ایک تقریری مقابلہ کروایا- جب پورے پاکستان میں دستور پاکستان کا جشن منایا گیا تو ادھر ہم نے وہ بھی بات چیت کی کہ کس طریقے سے ہم اس دستور کی حفاظت کر رہے ہیں اور کیسے کرنی چاہیے- آپ یہ سن کر حیران ہوں گے اور ہمیں خود بھی حیرانگی ہوئی کہ مدرسہ کے طلباء آئین پاکستان 1973 کو اتنا اچھے طریقے سے جانتے ہیں جتنا عام شہری نہیں جانتے۔

مدارس اور ریاست کی زمہ داریاں-:

آخر میں یہ کہوں گا کہ جو مدرسہ کی اصلاحات ہوئی ہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے کہ ہم کتنی دیر تک جاری رکھ کرتے ہیں؟ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے کہ ہمارے پاس کیا نقطہ نظر ہے؟ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے کہ ہمارے پاس کوئی امداد ہے؟ کوئی فرق نہیں پڑتا کتنے بڑے عزائم ہم رکھتے ہیں- لیکن جو میں نے جو تکون سمجھانا چاہتا ہو کہ جب تک باہمی طریقے سے ہم یہ سارے کام نہیں کریں گے، مثال کے طور پر سب سے پہلے تو ریاست کو فیصلہ کرنا ہو گا۔ ان مدرسوں کو مدرسے والوں کے رحم و کرم پہ نہیں چھوڑا جاسکتا-نہ آپ یہ الزام پھر نہیں لگا سکتے ہیں کہ شیعوں کے مدرسے ایران چلا رہے ہیں اور دیو بندیوں کے مدرسے سعودیہ سے چلائے جا رہے ہیں۔ الزام تراشی کو ختم

کریں اور ریاست کو انہیں اپنانا چاہیے کیونکہ یہ ہمارے بچے ہیں اور پاکستان کے بچے ہیں۔ ان کو ہم نے پڑھانا ہے ان کو ہم معاشرے میں شامل کرنا ہے اس کے لیے جس بنیادی ڈھانچے کی ضرورت ہے وہ پوری کریں۔ جتنی مالی امداد کی ضرورت ہے چلو پوری نہیں تو آدھی پوری کریں۔ تھوڑا بہت کریں لیکن ان کی مدد ضرور کریں۔ سب سے اہم ان کو اپنائیت دیں اور ابھی سارے مسائل حکومت کے ساتھ ہی نہیں ہیں بلکہ مدرسوں میں بھی ایک ماحول ہوتا ہے وہ تبدیلی کے مخالف ہیں۔ پوری دنیا بدل رہی ہے آپ بھی اس تبدیلی کو قبول کریں۔ ٹیکنالوجی اتنی ترقی کر چکی ہے کہ آپ بھی ٹیکنالوجی کو اپنائیں۔ میں ایک مدرسے میں گیا، وہاں پر 200 کمپیوٹر پڑے ہوئے ہیں اور سب کے اوپر غلاف چڑھے ہوئے ہیں۔ کسی نے عطیہ کیے تھے۔ کرسیاں بھی نئی ہیں۔ کمپیوٹر بھی نئے ہیں۔ وہ بڑے شوق سے مجھے لے گئے کہ یہ دیکھیں ہمارے پاس دو سو ورک سٹیشن ہیں۔ میں نے کہا کہ یہاں مجھے کوئی ایک سٹوڈنٹ لا کے بیٹھا دو اور اسے کہو کہ اسے استعمال کرے۔ میں اس سے سوال کروں گا کہ 'گوگل' کر کے بتائیں۔ کیا آپ یقین کریں گے وہ بمشکل ایک طالبعلم لا سکے۔ کیونکہ انہوں نے وہ دکھاوے کے لیے بنائے ہوئے ہیں۔ سکھانا کچھ نہیں ہے کہ بچے خراب ہو جائے گے کہ وہ انٹرنیٹ پہ جائے گا تو گندی اور فحاش فلمیں دیکھے گے۔ تو اگر آپ اس کو ادھر کمپیوٹر نہ بھی دکھائیں تو گھر جا کے دیکھ لے گے جب صبح یا شام کو باہر جائے گے یا پھر بازار میں جا کر دیکھ لے گا۔ جب آپ زبردستی (Oppression) کریں گے نہ تو جبر میں کبھی بھی ترقی نہیں ہو سکتی ہے۔ انہیں آزاد ذہن دیں۔ انہیں صحیح اور غلط خود سمجھنے کی صلاحیت دیں۔

اپنے بچوں کے لیے ہم کیا کرتے ہیں؟ میری فیملی میں سارے پڑھے لکھے ہیں لیکن بچوں کو موبائل نہیں دیتے - میری ان سے یہ لڑائی ہوتی رہتی ہے کہ آپ لوگ بڑے ہیں انہیں غلط اور صحیح سمجھائیں اور ان کی اچھی تربیت کریں-اسی طرح مدرسہ میں بھی ایک حد تک آزادی اور ایک تبدیلی کی ضرورت ہے تو پہلے ان مسائل کو حل کریں تب ہی یہ اصلاحات کامیاب ہوں گی۔ پھر ذمہ داری آتی ہے والدین کی کیونکہ مدارس کے طلبا ہیں وہ زیادہ تر ہمارے معاشرے کے سب سے کمزور درجہ کی آبادی کے بچے ہیں-ماں باپ ان کو مدرسے میں جمع کروادیتے ہیں اور اس کے بعد بھول جاتے ہیں نہ کپڑے، نہ ہی خوراک اور نہ ہی پیسے - کچھ بھی نہیں دیتے۔ والدین اور مدرسہ کی انتظامیہ کے درمیان ایک اچھا تعلق ہونا چاہیے - جیسے والدین اواساتذہ (پیرنٹ—ٹیچر) کی میٹنگ آپ 'بیکن ہاؤس سکول' یا پھر 'لاہور گرام سکول' میں میٹنگ کرتے ہیں- ہر مہینے یا ہر ہفتے جاتے ہیں-اسی طرح اپنے بچوں کو مدرسوں میں بھی جا کے دیکھئے کہ ان کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ میں بھی ایک مدرسے کا ذکر کروں گا- میرے ایک کزن کی بیٹی وہاں پڑھنے کے لیے گئی اور میں نے ویسے ہی ان سے کہا" یار! تم کبھی وہاں گئے؟" کہتا ہے کہ "نہیں وہ تو عالمہ کا کورس کر رہی ہے اور وہ خود بھی عالمہ بن گئی ہے-" کبھی تم نے یہ جا کے دیکھا، جب وہ وہاں پر گیا اور اس نے بچی کی حالت دیکھی- اسی دن بچی کو اٹھا کے لے آئے- کہتے ہیں یہ تو خراب ہو جائے گی۔ تو میں نے کہا" اگر یہ چیز آپ متہم کو بتائیں کہ بھئی یہ آپ کے نظام میں یہ مسئلے ہیں۔ وہ نظام ٹھیک ہو جائے گا۔" ہمارے والدین کی اس میں شمولیت نہیں ہے-اصلاحات کے لیے ان کو بھی شامل ہونے چاہیے. بحیثیت معاشرہ آپ اگر آنکھیں بند کرلیں گے تو اس سے بات نہیں بنے گی- بحیثیت معاشرہ

ہمیں بیدار ہونے کی ضرورت ہے۔ یہ پاکستانی بچے ہیں۔ ہم سب پاکستانی ان کی تربیت، ان کے مستقبل، ان کی صحت، ان کی ذہن سازی، ان سب چیزوں کے ذمہ دار ہیں۔ یہ نہ کہیں کہ یہ مدرسے سے نکل گیا ہے تو ابھی یہ کسی انتہا پسند تنظیم کا ممبر بن گیا ہے۔ وہ بنے گا اگر آپ نے اسے قبول نہیں کیا۔ اس معاشرے کو ان کا خیر مقدم کرنا چاہیے۔ وہ ہمارا خون ہیں، ہمارے بچے ہیں، ہمارا مستقبل ہیں۔ ان کو ہم نے تسلیم کرنا ہے۔

وزیرستان میں ایک سکول اور مدرسہ:

میں شمالی وزیرستان میں تھا تو وہاں پہ اصول یہ تھا کہ مدرسوں کا دورہ نہیں کیا جائے گا کیونکہ وہ اغوا کر کے لے جائیں گے یا مار دیں گے۔ میں بریگیڈ کمانڈر تھا۔ ایک دن شام کو میں نے شلوار قمیض پہنی۔ سینے پہ پاکستان کا جھنڈا لگایا اور جیپ پکڑی۔ ڈرائیور کو میں نے کہا! ایسے کرو پانچ چھ کلو جلیبیاں یونٹ سے منگواؤ اور گاڑی میں رکھواؤ۔ کوئی ایک ڈیڑھ کلو میٹر کے فاصلے پر ایک مدرسہ تھا۔ میں مغرب کی نماز کے وقت وہاں پہنچ گیا تو وہاں ہلچل مچ گئی کہ فوج آگئی کیونکہ فوجی جیپ تھی اور جھنڈا لگا ہوا ہے۔ سٹار پلیٹ لگی ہوئی ہے۔ مہتمم صاحب باہر ملنے کے لیے آئے۔ ابھی بچے گھور گھور کے مجھے دیکھ رہے ہیں کہ پتہ نہیں کہاں سے فوج آگئی؟ پتہ نہیں ابھی کیا ہوگا؟ میں نے ان کے ساتھ مغرب کی نماز پڑھی۔ بچوں میں مٹھائی تقسیم کی۔ ان کو بتایا کہ بیٹا پاکستان کیا ہے؟ ہم سب کیا ہیں؟ مجھ سے ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ مولوی صاحب کو اگلے دن کھانے پر بلا لیا۔ وہاں پر جب سے یہ دہشتگردی کے خلاف جنگ شروع ہوئی تھی کئی سالوں سے ایک سکول بند پڑا ہوا تھا۔ کچھ لوگوں سے بات کی۔ فیصل آباد کی ٹیکسٹائل والے کو فون کیا۔ ان کو بتایا

یار 200 بچوں کے یونیفارم بنا کے بھیج دو- انہوں نے وہ بھیج دیے اور وہ سروس شوز والے بھائی وہ اس وقت منسٹر تھے غالباً، ان کو میں نے فون کیا کہ سر میں برگیڈ کمانڈر بول رہا ہوں اگر آپ اتنے بچوں کے لیے، مختلف سائزز کے سروس شوز بھیج دیں تو انھوں نے وہ سو شوز دس پندرہ ڈبوں میں پشاور بھیج دیے- وہاں سے ہم خود لے کر آئے- فرنیچر والوں کو بتایا انھوں نے فرنیچر بھیج دیا- کوئی تین چار لاکھ روپے ہم نے اپنے برگیڈ رفنڈ سے لگائے۔ سکول نیا کر دیا- ہم نے 18 بچوں سے شروع کیا اور ایک سال کے اندر اندر 400 بچہ اس سکول میں پڑھتا تھا- اس سکول کے میں ہم نے بیکن ہاؤس لاہور کا نصاب ان کی کتابیں متعارف کروائیں- بات درد کی ہے۔ میں معاشرے کی بات کر رہا تھا، بطور معاشرہ ہمارے اندر احساس نہیں ہے- ہم تفریق اور نفی کرنے میں بہت تیز ہیں کہ یہ شیعہ ہے تو یہ کافر ہو گیا- یہ فلاں ہے تو یہ، یہ ہو گیا ہے۔ او بھائی! جو بھی ہے انسان کا بچہ ہے اور وہ آزادانہ طور پر پاکستان میں رہتے ہیں- وہ پاکستانی ہیں- پہلے اس کو پاکستانی بناؤ- اچھا انسان بناؤ- کوئی اچھا انسان بنے گا تو دین خود بخود اس کے اندر آجائے گا۔ کسی دین کی کتاب میں یا یہ چاروں کتابیں جو ہم پڑھتے ہیں، کسی میں جبر نہیں ہے- کسی میں ظلم، جھوٹ، زناکاری نہیں ہے- کسی میں شراب اور دھوکہ دہی اور قتل جائز نہیں ہے۔ یہ انسانیت کا دین ہے- سارے مذاہب جب اللہ تعالی نے اتارے وہ انسانیت کے لیے ہی اتارے ہیں- ہاں آخر میں آکر قرآن شریف میں اس کو مکمل کر دیا۔ اس کو پڑھ لیں۔ اگر کوئی پڑھ رہا ہے تو اس کو پڑھنے دیں- وہ بھی ٹھیک ہے۔ وہ بہترین انسان بن جائے گا۔ اگر کوئی پردہ کرتا ہے تو وہ بھی ٹھیک ہے- اگر نہیں کرتا تب بھی مرضی ہے- انسان بہتر ہونا چاہیے- انسان بنائیں اور یہ کام ہم بطور معاشرہ کر سکتے ہیں- اور یہی

مدرسہ کی اصلاحات کی بنیادیں ہیں جن کا ہم ہر جگہ پرچار کرتے ہیں اور ہمیں بطور معاشرہ ان اصلاحات کو لے کر آگے بڑھنا چاہیے۔ ہمارے بچے انشاءاللہ خود بخود ٹھیک ہو جائیں گے۔

خلافت یا قومی ریاست

بیرسٹر ظفراللہ خان

بیرسٹر ظفراللہ خان، سابق وفاقی وزیر برائے قانون اور مصنف ہیں۔انہوں نے اس مضمون میں ریاستی نظام پر بات کی ہے۔ خصوصا مسلمانوں کے ہاں پائے جانے والے سیاسی مذہبی تصورات کا تفصیلی تجزیہ پیش کیا ہے کہ خلافت کا تاریخی پس منظر کیا تھا، معاصر ریاستی نظم کے کیا تقاضے ہیں اور یہ کہ کیا قومی ریاست اسلامی اقدار و تعلیمات کے خلاف ہے۔ اس کے ساتھ حکومت کی انسانی تاریخ پر بھی بات کی ہے۔

قرآن کریم میں اللہ تعالی نے انسانوں کی پیدائش اور ان کے باہمی تعلق کو بیان کرتے ہوئے ایک جگہ فرمایا ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَاۗىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ۭ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ .

(لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمھاری قومیں اور برادریاں بنادیں، تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو (اس لیے نہیں کہ تم ایک دوسرے سے نفرت کرو)

انسانوں کے درمیان یہ تعلق اور قرب کا رشتہ بتاتا ہے کہ انسان ایک دوسرے کی مخالفت کی سرشت پر پیدا نہیں کیے گئے، بلکہ وہ ایک دوسرے کے لیے پرامن اور سیکھنے سکھانے کا ربط رکھتے ہیں۔ اسی ضمن میں ریاستی نظم کا معاملہ بھی آجاتا ہے، جو تمام

انسانوں کی مشترکہ تجرباتی میراث ہے۔ عام طور پہ مسلمانوں کے ہاں خلافت کا تصور بہت غالب ہے۔

ا۔ 'خلافت' کا لفظ 'خلیفہ' (جانشین) سے نکلا ہے جو مسلم قوم کا حکمران ہوتا ہے۔ جب حضور نبی کریم ﷺ دنیا سے پردہ فرما گئے تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ ﷺ کے جانشین (بطور سیاسی اتھارٹی) منتخب ہوئے تو انہیں خلیفۂ رسول اللہ (پیغمبرِ خدا کا جانشین) کہا جاتا تھا۔ قرآن مجید میں اسی طرح یہ اصطلاح اسی مفہوم میں حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام تک بطور خلفائے خدا استعمال ہوتی رہی۔ جب فرشتوں سے گفتگو کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ۭ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۭ قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ .

(اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں زمین میں نائب بنانے والا ہوں۔ انہوں نے عرض کیا: کیا آپ زمین میں ایسا نائب بنائیں گے جو اس میں فساد کرے گا اور خون بہائے گا جبکہ ہم حمد و ثناء کے ساتھ تیری تسبیح و تقدیس بیان کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا جو کچھ میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے)

یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ .

(اے داؤد علیہ السلام! ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے لہٰذا لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلے کریں)

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۔

(اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں، انہیں اللہ تعالیٰ زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے لوگوں کو بنا چکا ہے۔ ان کے لیے ان کے اس دین کو مضبوط کرے گا جسے اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں پسند فرمایا ہے اور ان کے خوف کو امن میں بدل دے گا۔ بس وہ میری بندگی کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور جو اس کے بعد کفر کرے تو ایسے لوگ فاسق ہیں)

۲۔ بعض ایسے اہل دانش و علم ہیں جن کا استدلال یہ ہے کہ پوری 'امتِ مسلمہ' کے لیے ایک ہی خلیفہ ہونا چاہیے۔ عربی میں امہ سے مراد 'عوام' ہیں اور یہ لفظ خصوصاً ان مسلمانوں کا حوالہ دیتا ہے جن کا نظریۂ حیات اور تہذیب و ثقافت ایک ہو۔ لفظ 'امہ' اس کے محتاط و مخصوص مفہوم کے علاوہ عربی میں یہ عمومی مفہوم میں بھی مشترک مفاد رکھنے والے عوام کے لیے آیا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد مبارک ہے کہ

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۭ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ اَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ.

(تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے بنائی گئی ہے کہ تم نیک باتوں کا حکم کرتے اور بری باتوں سے منع کرتے ہو اور اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہو اور اگر اہل کتاب ایمان لاتے تو ان کے لیے بہتر تھا۔ ان میں ایمان والے بھی ہیں لیکن ان کے اکثر فاسق ہیں)

لفظ اُمہ کی مزید وضاحت میثاق مدینہ (دستورِ مدینہ) سے ہوتی ہے جس کے لیے حضور نبی اکرم ﷺ نے 622ء میں مدینہ کے سرکردہ قبیلوں سے مذاکرات کئے۔ ان میں یہودیوں، عیسائیوں اور لا مذہب شہریوں کا واضح طور پر 'اُمتہ واحدہ' کے ارکان ہونے کا حوالہ دیا گیا ہے۔

قرآن مجید کی متذکرہ بالا آیات سے اس امر کی خاصی وضاحت ہو گئی ہے کہ قرآن مجید عالمگیر خلافت کے قیام کا حکم نہیں دیتا بلکہ یہ ایک سیاسی تشکیل ہے جو کہ ایک تاریخی عمل ہے۔ مسلمان روئے زمین پر اللہ تعالیٰ کا خلیفہ (نائب) اور انہیں کہا گیا ہے کہ اگر وہ کسی رقبے یا علاقے میں اپنا کنٹرول قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو وہاں اس کے احکامات کی پابندی کریں۔ وہ ان احکامات کو دستیاب سیاسی حالات میں زمانے کی سپرٹ کے مطابق بروئے کار لائیں۔

۳۔ جدید قومی ریاست جدید تاریخ میں ایک سیاسی فکر و عمل کے ارتقاء کا ایک ماحصل ہے۔ جدید قومی ریاست 1648ء میں ویسٹ فیلیا معاہدۂ امن کے بعد ظہور پذیر ہوئی جو رومی مقدس حکومت (Holy Roman Empire) کی آخری شکست وریخت کا نتیجہ تھی۔ اس 'معاہدے' نے رومی مقدس حکومت کے اندر تیس (30) سالہ خونریز جنگ (1618ء - 1648ء) اور سپین اور ڈچ ری پبلک کے مابین اسی (80) سالہ جنگ

(1568ء - 1648ء) کے بعد یورپ کے روحانی اور دنیاوی اتحاد کو بالکل تباہ و برباد کر کے رکھ دیا تھا۔

ایک قومی ریاست کی یہ تعریف کی جاسکتی ہے کہ ایک قائم بالذات جغرافیائی وجود جس کی شناخت یہ ہو کہ اس نے اپنا سیاسی جواز مطلق العنان رہ سکنے والی قوم کے طور پر حاصل کیا ہو۔ اس کا موازنہ کسی کثیر القومی ریاست، کسی شہری ریاست، کسی ایک بادشاہت، کسی ایک وفاق یا کسی دیگر ذی اختیار ساخت کے ساتھ کیا جاسکتا ہو۔ قومی ریاستیں اپنی تاثیر کے لیے ایک واضح مرکزی کنٹرول کی حامل ہوتی ہیں اور اپنی خود مختار حیثیت پر عمل درآمد کی اہلیت رکھتی ہیں اور ایک دوسرے کی حاکمیت اور علاقے کو تسلیم کرتی ہیں۔ نظری اعتبار سے جدید قومی ریاست پندرہویں اور سولہویں صدیوں میں سیاسی معیشت، سرمایہ داری، تاجریت، سیاسی جغرافیہ اور سیاسی فلسفہ کے شعبوں میں ذہنی ارتقا کی ایک ضمنی پیداوار ہے۔

'قومی ریاست' کے ظہور سے قبل متعدد بادشاہتیں موجود تھیں۔ مثلاً آسٹریا کی بادشاہت، فرانس کی بادشاہت، ہنگری کی بادشاہت، عثمانیوں کی بادشاہت، مغل بادشاہت، صفوی بادشاہت، برطانوی بادشاہت وغیرہ۔ یہ قومی ریاستیں کثیر النسلی بادشاہتیں تھیں جن پر ایک بادشاہ، ایک شہنشاہ، ایک سلطان یا ایک خلیفہ حکمران تھا۔

۴۔ مسلمانوں کو سلطنتوں اور خلافتوں کا تاریخی تجربہ حاصل ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے شہری ریاست مدینہ منورہ قائم فرمائی جس کا ایک تحریری دستور تھا جسے میثاقِ مدینہ کہا جاتا تھا۔ یہ ریاست 622ء میں آپ ﷺ کے ہجرت کر کے مدینہ منورہ

پہنچنے کے فوراً بعد قائم ہوئی۔ اس دستور کے لیے ہجرت کر کے آنے والے قبیلہ قریش اور آٹھ دیگر مقامی قبیلوں کے درمیان مذاکرات ہوئے۔ ان قبیلوں میں یہودی قبائل بھی شامل تھے۔ اس دستور نے ایک کثیر مذہبی ریاست کے لیے قانونی بنیاد تشکیل کر دی اور سب کو ایک قومی امہ (one nation) قرار دیا۔ یہ قومی امہ (nation) سب لوگوں سے منفرد تھی۔

حضور نبی کریم ﷺ 632ء میں دنیا سے پردہ فرما گئے اور مدینہ کی شہری ریاست خلافتِ راشدہ میں تبدیل ہو گئی۔ یہ چار خلفائے راشدین کی سیاسی و مذہبی قیادت کے ماتحت تھی۔ یہ خلافت بتدریج وسیع سے وسیع تر ہوتی گئی جس نے میسوپوٹیمیا (عراق و شام)، مشرقی بحیرۂ روم، اناطولیہ، سلطنتِ ساسانیہ، شمالی افریقہ (مصر اور تیونس)، کوہ قاف اور جزیرہ نمائے عرب کو فتح کر لیا۔ خلافت راشدہ کے بعد بنی امیہ کی سلطنت قائم ہو گئی جس کی بنیاد حضرت امیر معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رکھی اور اس کا خاتمہ مروان ثانی کی وفات پر 750ء میں ہوا۔ بنی امیہ نے مسلمانوں کی فتوحات کا دائرہ کاکیشیا، ماوراالنہر (ٹرانسوکشیانہ)، سندھ، مغرب اور جزیرہ نمائے آئبیریا (اندلس) تک بڑھا دیا جو ڈیڑھ کروڑ مربع کلومیٹر (57 لاکھ 90 ہزار مربع میل) رقبہ تھا۔ اس طرح بہ لحاظ رقبہ یہ دنیا کی وسیع ترین سلطنت تھی جو کبھی اہل دنیا نے دیکھی تھی۔ یہ پوری تاریخ انسانی کی پانچویں وسیع ترین سلطنت بنی۔

750ء میں عباسیوں کے انقلابات نے بنو امیہ کا تختہ الٹ دیا تاہم ان کی ایک شاخ فرار ہو کر شمالی افریقہ پہنچ گئی اور پھر وہاں سے اندلس چلی گئی جہاں انہوں نے خلافت قرطبہ قائم کر لی جو 1031ء تک قائم رہی۔ عباسی انقلاب بنو امیہ کی عرب بادشاہت کا اختتام

اور ایک زیادہ جامع اور کثیر النسلی ریاست کا آغاز تھا جس میں غالب تعداد حضور نبی اکرم ﷺ کے سلسلۂ نسب سے تعلق رکھنے والوں اور ایرانی نژاد لوگوں کی تھی۔ عباس سفاح پہلا عباسی خلیفہ تھا اور اس کا تعلق بنو ہاشم سے تھا جو کہ قبیلہ قریش کی ایک ذیلی شاخ تھی۔ آخری عباسی خلیفہ المستعصم باللہ تھا جو 1213ء سے 1258ء تک برسر اقتدار رہا۔ عباسی عہد میں مصر میں فاطمی خلافت 909ء میں قائم ہوئی اور 1171ء تک قائم رہی۔ خلفائے قاہرہ 1261 اور 1517 کے درمیان رہے۔ جنہیں مملوک سلطانوں کی سرپرستی حاصل تھی۔ مملوک سلطنت نے 1250ء سے 1517ء تک مصر، مشرقی بحیرہ روم اور حجاز کو کنٹرول کیے رکھا۔

(5)۔ ذیل کے چارٹ سے مزید واضح ہو جائے گا کہ دنیا میں ایک ہی وقت میں مسلمانوں کی بہت سی ریاستیں موجود تھیں :

- مسلم خلافتیں / بادشاہتیں

(i)۔ خلافت راشدہ (632ء-661ء)

(ii)۔ سلطنت خلافت بنوامیہ (661ء-750ء)

(iii)۔ سلطنت قرطبہ، اسلامی سپین (756ء-1031ء)

(iv)۔ سلطنت خلافت عباسیہ (750ء-1258ء)

(v)۔ سلطنت خلافت فاطمین (910ء-1171ء)

(vi)۔ سلطنت ایوبی خاندان (1171ء-1260ء)

(vii)۔ سلطنت خلافت مملوک (بحری خاندان) (1250ء-1517ء)

(viii)۔ سلطنت خلافت عثمانیہ (1517ء-1923ء)

- مسلمانوں کی علاقائی بادشاہتیں

یورپ اور روس

(i)۔ سلطنت قرطبہ، بنوامیہ، سپین (929ء-1031ء)

(ii)۔ سلطنت امارت سسلی (996ء-1072ء)

(iii)۔ سلطنت والگابلغاریہ (992ء-1236ء)

(iv)۔ سلطنت گولڈن ہورڈ (1251ء-1502ء)

(v)۔ سلطنت اہل کریمیا (1441ء-1783ء)

مشرقِ وسطیٰ

(i)۔ سلطنت روم، سلجوق (1077ء-1307ء)

(ii)۔ سلطنت عثمانیہ (1299ء-1923ء)

(iii)۔ سلطنت خاندان خوارزم شاہ (994ء-1040ء)

(iv)۔ سلطنت طاہری خاندان (821ء-873ء)

(v)۔ سلطنت خوارزمی (1077ء-1231ء)

(vi)۔ سلطنت سفاری خاندان (861ء-1003ء)

(vii)۔ سلطنت سمانی خاندان (819ء-999ء)

(viii)۔ سلطنت سلجوق خاندان (1016ء-1153ء)

(ix)۔ سلطنت جیرے خاندان (1521ء-1550ء)

(x)۔ سلطنت الخانی (1256ء-1335ء/1353ء)

(xi)۔ سلطنت تیموری خاندان (1370ء-1507ء)

(xii)۔ سلطنت ایوبی خاندان (1171ء-1260ء)

(xiii)۔ سلطنت آق قویونلو (1378ء-1501ء)

(xiv)۔ سلطنت قرہ قویونلو (1375ء-1468ء)

(xv)۔ سلطنت ایران، صفوی خاندان (1502ء-1736ء)

(xvi)۔ سلطنت افشاری خاندان (1736ء-1796ء)

(xvii)۔ سلطنت قاچار خاندان (1789ء-1925ء)

(xviii)۔ سلطنت مظفری (1391ء-1583ء)

(xix)۔ سلطنت شیروان شاہ (861ء-1539ء)

(xx)۔ سلطنت غوری (1149ء-1161ء)

(xxi)۔ سلطنت غزنوی (977ء-1186ء)

(xxii)۔ سلطنت عظیم سلجوق (1175ء-1194ء)

(xxiii)۔ سلطنت آل بویہ (934ء-1062ء)

(xxiv)۔ سلطنت راسی آف یمن (897ء-1962ء)

(xxv)۔ سلطنت بنو رسول آف یمن (1229ء-1454ء)

(xxvi)۔ سلطنت طولونیہ (868ء-905ء)

وسطی ایشیا

(i)۔ سلطنت چغتائی خاندان (1260ء-1266ء)

(ii)۔ سلطنت سائیبیر یا خاندان (1490ء-1598ء)

(iii)۔ سلطنت یار قند (1514ء-1533ء)

(iv)۔ سلطنت شیبانی (1428ء-1468ء)

افریقہ اور سپین

(i)۔ سلطنت عدل (1415ء-1555ء)

(ii)۔ سلطنت المورد خاندان آف مراکش (1040ء-1147ء)

(iii)۔ سلطنت الموحد خاندان آف مراکش (1121ء-1269ء)

(iv)۔ سلطنت اجوران (تیرہویں صدی-سترہویں صدی)

(v)۔ سلطنت فلانی آف سکوٹو (1804ء-1903ء)

(vi)۔ سلطنت فلانی آف سیکوامدادو (تیرہویں صدی-سترہویں صدی)

(vii)۔ سلطنت فلانی/فلبی آف الحاج عمر تال (1797ء-1864ء)

(viii)۔ سلطنت فلانی یا فلبی آف بوند و ملک داؤد سائی (1230ء-1600ء)

(ix)۔ سلطنت مالی (1230ء-1600ء)

(x)۔ سلطنت سونگھائی (1340ء-1591ء)

(xi)۔ سلطنت کلوہ (دسویں صدی-1517ء)

(xii)۔ سلطنت عمان (تیرہویں صدی-1744)

(xiii)۔ سلطنت اغالبہ خاندان افریقیہ تونس، مشرقی الجیریا، مغربی لیبیا اور سسلی (800ء-909ء)

(xiv)۔ سلطنت امیہ آف سپین، فاطمیوں سے جنگ کے دوران (661ء-750ء)

(xv)۔ سلطنت سپین آف الطوائف مملوک (1009۔1238)

(xvi)۔ سلطنت بنو حفص (1229ء-1574ء)

(xvii)۔ سلطنت علوی خاندان آف مراکش (1631ء-1672ء)

(xviii)۔ سلطنت مرینیہ خاندان آف مراکش (1244ء-1465ء)

(xix)۔ سلطنت رستمی خاندان (767ء-909ء)

(xx)۔ سلطنت وطاسی خاندان آف مراکش (1472ء-1554ء)

(xxi)۔ سلطنت سعدی خاندان آف مراکش (1511ء-1628ء)

(xxii)۔ سلطنت درویش (1896ء-1920ء)

جنوبی ایشیا

(i)۔ سلطنت علی راجہ (1545ء-1819ء)

(ii)۔ سلطنت میسور (1704ء-1799ء)

(iii)۔ سلطنت دہلی، شمالی ہند (1206ء-1526ء)

(iv)۔ سلطنت مغل ہندوستان (1526ء-1857ء)

(v)۔ سلطنت خلجی خاندان (1290ء-1320ء)

(vi)۔ سلطنت لودھی خاندان (1451ء-1524ء)

(vii)۔ سلطنت دہلی، مملوک خاندان (1206ء-1290ء)

(viii)۔ سلطنت درّانی (1747ء-1823ء)

(ix)۔ سلطنت سوری خاندان (1540ء-1556ء)

(x)۔ سلطنت آصف جاہی خاندان (1720ء-1948ء)

(xi)۔ سلطنت نوابِ اودھ (1732ء-1856ء)

(xii)۔ سلطنت باہمنی، دکن (1347ء-1527ء)

(xiii)۔ سلطنت تغلق خاندان (1321ء-1398ء)

(xiv)۔ سلطنت برار، دکن (1490ء-1572ء)

(xv)۔ سلطنت بدار، دکن (1492ء-1619ء)

(xvi)۔ سلطنت احمد نگر، دکن (1490ء-1636ء)

(xvii)۔ سلطنت قطب شاہی خاندان، دکن (1518ء-1687ء)

(xviii)۔ سلطنت بیجاپور، دکن (1490ء-1686ء)

(xix)۔ سلطنت خاندانِ سادات (1414ء-1451ء)

(xx)۔ سلطنت بنگال (1336ء-1576ء)

(xxi)۔ سلطنت جونپور (1394ء-1479ء)

(xxii)۔ سلطنت گجرات (1407ء-1573ء)

(xxiii)۔ سلطنت کشمیر (1346ء-1586ء)

(xxiv)۔ سلطنت سومرو خاندان (1026ء-1351ء)

(xxv)۔ سلطنت سمہ خاندان (1335ء-1520ء)

(xxvi)۔ سلطنت تالپور خاندان (1783ء-1843ء)

(xxvii)۔ سلطنت کلہوڑا خاندان (1701ء-1783ء)

(xxviii)۔ سلطنت نواب کرناٹک (1692ء-1859ء)

جنوب مشرقی ایشیا

(i)۔ سلطنت جوہر (1528ء-188ء)

(ii)۔ سلطنت ماگوئندا ناؤ (1500ء-1888ء)

(iii)۔ سلطنت کیلنٹن (1411ء-1963ء)

(iv)۔ سلطنت ترنگانو (1909ء-1957ء)

(v)۔ سلطنت پرلیس (1821ء-1957ء)

(vi)۔ سلطنت کیداہ (1909ء-1946ء)

(vii)۔ سلطنت پاہنگ (1895ء-1948ء)

(viii)۔ سلطنت پیرک (1528ء-1948ء)

(ix)۔ سلطنت نگری سمبیلان (1895ء-1948ء)

(x)۔ سلطنت سلانگور (1895ء-1948ء)

(xi)۔ سلطنت سُولو (1405ء-1915ء)

(xii)۔ سلطنت یوجیاکرتا (1755ء-1939ء)

(xiii)۔ سلطنت آچے (1946ء-1906ء)

(xiv)۔ سلطنت دہلی (1632ء-1946ء)

(xv)۔ سلطنت سیاک سری اندراپورا (1725ء-1946ء)

(xvi)۔ سلطنت ریاؤ (1824ء—1911ء)

(xvii)۔ سلطنت اندراگیری (1298۔1945)

(xviii)۔ سلطنت جمبی (1877ء-1904ء)

(xix)۔ سلطنت پالمبانگ دارالسلام (1675ء-1823ء)

(xx)۔ سلطنت بینتن (1527ء-1813ء)

(xxi)۔ سلطنت شیربیون (1445ء-1677ء)

(xxii)۔ سلطنت دیماک (1475ء-1548ء)

(xxiii)۔ سلطنت سوراکارتہ (1745ء-1946ء)

(xxiv)۔ سلطنت ماتارام (1587ء-1722ء)

(xxv)۔ سلطنت بونتیاناک (1771ء-1950ء)

(xxvi)۔ سلطنت بانجارماسین (1525ء-2010ء)

(xxvii)۔ سلطنت کوتائی (1949ء تک)

(xxviii)۔ سلطنت بوگنگان (1731ء-1964)

(xxxix)۔ سلطنت گوا (1300ء-1945ء)

(xxx)۔ سلطنت ترنات (1257ء-1914ء)

(xxxi)۔ سلطنت تیدور (1450ء-1904ء)

(xxxii)۔ سلطنت باکان (1513ء)

(xxxiii)۔ سلطنت جیلولو (1500ء-1920ء)

(xxxiv)۔ سلطنت بوتون (1450ء-1904ء)

۶۔ مندرجہ بالا مختصر بحث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آمد اسلام سے لے کر اب تک خلافت راشدہ کے بعد کوئی اس جیسی مہتم بالشان مسلم اسلامی خلافت نہیں آئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی عالمگیر خلافت قائم نہیں ہوئی جو پوری مسلم دنیا کی دنیوی اور سیاسی وحدت کی مظہر ہوتی۔ سنی مسلمانوں کی اکثریت خلافت راشدہ سے متعلق یکسو ہے تاہم اہل تشیع اسے بھی قبول نہیں کرتے۔ بعض اندازوں کے مطابق اہل تشیع پوری مسلم آبادی کا دس (10) سے تیرہ (13) فیصدی ہیں۔ ایران میں ان کی آبادی سب سے زیادہ ہے جو وہاں کی آبادی کا نوے (90) سے پچانوے (98) فیصد ہیں جبکہ انڈونیشیا میں ان کی آبادی بہت کم ہے یعنی وہ وہاں صرف 0.5 فیصد ہیں۔

پہلی عالمگیر مسلم خلافت (خلافتِ راشدہ) کا انتظام و انصرام حضور نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرامؓ کے ہاتھ میں تھا۔ اس کے باوجود بھی وہ تیسرے خلیفہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد میں چند مسائل کا شکار ہو گئی تھی۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مسلمانوں کے درمیان خانہ جنگی سے بچنے کے لیے پولیس ایکشن کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ بلوائیوں کے بارے میں ان کے نرم و شائستہ رویے سے یہ لوگ مزید دلیر ہو گئے۔ 656ء میں جب آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تلاوت قرآن پاک کر رہے تھے تو بلوائی دروازہ توڑ کر گھر میں اندر داخل ہو گئے اور آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شہید کر دیا۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے بعد امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے درمیان خانہ جنگی چھڑ گئی۔ موخر

الذکر، حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے رشتہ دار تھے اور ایک قبیلہ بنوامیہ سے تھے۔

خانہ جنگی کی پہلی لڑائی جنگ جمل (اونٹوں کی جنگ) تھی جو 'برّا' (عراق) کے مقام پر ہوئی۔ یہ نومبر 656ء میں ہوئی تھی۔ ایک طرف امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دوسری جانب حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی افواج تھیں۔ جنہیں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حمایت حاصل تھی۔ یہ سب کبائر صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین تھے۔ بعض روایات کے مطابق دونوں اطراف سے دس ہزار (10000) سپاہی شہید ہوئے۔ دوسری لڑائی جنگ صفّین کہلاتی ہے۔ یہ جولائی 657ء میں ہوئی تھی۔ یہ شام کے علاقے الرّقاع میں لڑی گئی۔ امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فوج اسی ہزار (80000) مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ جن میں ستر (70) صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین وہ تھے جنہوں نے غزوۂ بدر میں شرکت کی تھی۔ ستر (70) وہ تھے جنہوں نے حدیبیہ کے مقام پر حلف اٹھایا تھا۔ چار سو (400) جلیل القدر انصاری اور مہاجرین تھے۔ جب کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فوج میں زیادہ تر شامی تھے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فوج کے اندازاً پچیس ہزار (25000) اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فوج کے پنتالیس ہزار (45000) افراد شہید ہوئے۔

جمل اور صفّین کی جنگوں نے سنیوں اور شیعوں کے مابین مستقل خلیج حائل کر دی۔ ان کے نتیجے میں 'خوارج' نے بھی جنم لے لیا اور مسلمانوں میں سیاسی وحدت کا ہمیشہ کے

لیے خاتمہ ہو گیا۔ کیا اب خلافت قائم ہو سکتی ہے جب کہ مسلم دنیا میں متعدد سیاسی، مذہبی علاقائی نسلی اور دیگر تفرقے موجود ہیں؟

۷۔ امام خمینی نے 1979ء میں ایران میں ایک اسلامی ریاست قائم کی تھی جس پر مسلمانان عالم نے عمومی طور پر اور عرب ہمسایوں نے خصوصی طور پر منفی تاثر کا اظہار کیا۔ اس کے نتیجے میں ایران اور عراق کے مابین جنگ ہو گئی جو آٹھ سال (1980ء-1988ء) جاری رہی۔ یہ بیسویں صدی عیسوی کی سب سے بڑی روایتی جنگ تھی۔ اس سے عراق میں اندازاً ایک لاکھ پانچ ہزار سے دو لاکھ تک (200,000-150,000) اموات ہوئیں۔ چار لاکھ (400,000) افراد زخمی ہوئے اور ستر ہزار (700,000) کو جنگی قیدی بنالیا گیا۔

ایران میں اموات تقریباً دو لاکھ (220,000—200,000) ہوئیں جبکہ بعض لوگوں کا اندازہ ہے کہ دس لاکھ سے زیادہ ایرانی ہلاک ہوئے۔ جمل اور صفین کی جنگوں اور حالیہ ایران عراق جنگ کی روشنی میں کیا ممکن ہے کہ پوری مسلم دنیا میں ایک خلافت قائم ہو جائے گی؟ کیا اہل تشیع ایک سنی خلیفہ کو قبول کر لیں گے؟ کیا سنی ایک شیعہ خلیفہ کو قبول کر لیں گے؟ کیا ایک بنگلہ دیشی مسلمان پاکستانی خلیفہ کو قبول کر سکتا ہے؟

۸۔ مختصراً یہ کہ ایک ہمہ گیر مسلم خلافت کا دعویٰ اور اس کے قیام کے لیے جدوجہد ان زمینی حقائق کی روشنی میں ایک ناقابلِ عمل رومانوی تصور ہے۔ بالخصوص ایسی صورت میں جبکہ ایک نیا سیاسی فلسفہ ارتقاء کی منزلیں طے کر رہا ہے اور جدید قومی ریاستوں کی تشکیل اور حصار بندی ہو رہی ہے۔ امتِ مسلمہ کے اندر اتحاد کی خواہش کو

عملی شکل دی جاسکتی ہے۔ وہ اس طرح کہ مسلم ریاستوں کی ایک 'دولت مشترکہ' کا قیام موجودہ تنظیم اسلامی کانفرنس (OIC) کو تقویت دے گا۔ اس حقیقت کے باوجود کہ مندرجہ بالا حقیقتوں نے اس تنظیم کو اپاہج بنا کر رکھ دیا ہے۔

حضرت اقبالؒ نے جو جدید اسلام کے حوالے سے گہری بصیرت رکھتے ہیں، بالکل بجا کہا ہے:

ترکوں کے نظریے کو سمجھنے کے لیے، آیئے ہم اولین مورخ اسلام ابن خلدون سے رہنمائی حاصل کریں۔ ابن خلدون اپنی مشہور تصنیف 'مقدمہ' میں اسلام میں ہمہ گیر خلافت کے بارے میں تین واضح تصورات پیش کرتا ہے: (ا) یہ کہ یہ ایک الوہی ادارہ ہے اور ناگزیر ہے۔ (ب) یہ کہ یہ نظم و نسق اور مصلحت سیاسی کا تقاضا ہے اور (ج) یہ کہ اس کی کوئی ضرورت ہی نہیں جو خوارج کا نقطۂ نظر ہے۔ جدید ترکی نے معتزلہ کا زاویہ نگاہ اختیار کیا کہ یہ کوئی الوہی حکم نہیں بلکہ مصلحت کا تقاضا ہے۔ (دوسرا نقطہ نظر) تجربے نے ثابت کیا ہے کہ تمام عالم اسلام میں ایک خلیفہ عملاً بے معنی ہو گیا ہے۔ ملت اسلامیہ اقوام عالم میں اس طرح بٹ گئی ہے کہ اب دوبارہ اس کو وحدانی مملکت اور خلافت بنانا امرِ محال ہے۔ اب یہ خیال نہ صرف یہ کہ کوئی نتیجہ پیدا نہیں کر سکتا بلکہ اس کے اثرات ضرر رساں ہیں جو اقوام اسلامیہ کے اتحاد میں حائل ہوتے ہیں۔ شروع صدیوں میں خلیفہ کے لیے قریشی ہونا بھی لازمی شرط شمار ہوتا تھا۔ عربوں اور قریشیوں کے زوال کے بعد قاضی ابو بکر باقلانیؒ نے یہ فتویٰ دیا کہ اب یہ شرط ساقط ہو گئی ہے۔ ابن خلدون کا بھی یہی خیال تھا کہ اب جس کے ہاتھ میں قوت آجائے اس کو خلیفہ مان لینے کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ ترکوں نے عملی تجربۂ سیاست اور تاریخ کو پیش نظر رکھ کر

فیصلہ کیا ہے۔ محض فقیہانہ بحث نہیں کی۔ عربوں کی شہنشاہی مملکت کا زمانہ عرصۂ دراز ہوا کہ ختم ہو گیا۔ لیکن اس کا سایہ اسلامی فقہ پر اب تک پڑ رہا ہے۔ میرے خیال میں اس سلسلے میں پیش کئے گئے دلائل کو اگر صحیح طور پر سمجھا جائے تو نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ ایک بین الاقوامی نصب العین جو کہ اگرچہ اسلام کی صحیح روح ہے اس پر عرب شہنشاہیت نہ صرف سایہ فگن ہوئی بلکہ اس نے اس روح کی جگہ لے لی ہے۔ سرِدست ہر مسلم قوم کو اپنے اندر مستغرق ہو کر اپنے نقطہ نظر کو عارضی طور پر خود پر مرتکز کر لینا چاہیے تاوقتیکہ وہ سب مضبوط اور طاقتور ہو کر جمہوری ریاستوں کا ایک زندہ خاندان بن کر ابھر آئیں۔ قومی جذبے سے سرشار مفکرین کے مطابق ایک سچا اور جاندار اتحاد محض علامتی سرداری کے ذریعے قائم کر لینا آسان نہیں ہے۔ اس کا حقیقی اظہار آزاد اور خود مختار اکائیوں میں ہے۔ جن کی نسلی رقابتوں کو سدھار کر مشترک روحانی امنگ کے ساتھ ہم آہنگ بنا دیا گیا ہو۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں آہستہ آہستہ اس سچائی تک لے جا رہا ہے کہ اسلام نہ تو ایک قومیت ہے اور نہ شہنشاہیت ہے بلکہ ایک جمعیتِ اقوام ہے جو مصنوعی حد بندیوں اور نسلی امتیازات کو صرف حوالے کے طور پر استعمال کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ جبکہ اس کے ارکان کے معاشرتی افق کو محدود کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

۹۔ میری عاجزانہ رائے میں قرارداد مقاصد جو 12 مارچ 1949ء کو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے منظور کی ایک اہم سیاسی فکری پیش قدمی ہے۔ اس میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ مستقبل کا پاکستانی دستور سراسر یورپی نمونے پر نہیں بنایا جائے گا بلکہ یہ اسلام کے نظریئے اور جمہوری عقیدے پر استوار ہو گا۔ یہ قرارداد 1956ء، 1962ء اور 1973ء

کے دساتیر کا دیباچہ بنی اور بالآخر آرٹیکل 2(A) کے تحت جب 1973ء کے دستور میں آٹھویں ترمیم کی 1985ء میں منظوری ہوئی تو یہ دستور پاکستان کا حصہ بن گئی۔ قرار داد مقاصد کا متن یہ ہے:

یہ ایک حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کل کائنات کا بلا شرکتِ غیرے حاکمِ مطلق ہے اور اسی نے جمہور کی وساطت سے مملکتِ پاکستان کو اختیارِ حکمرانی اپنی مقرر کردہ حدود کے اندر استعمال کرنے کے لیے نیابتاً عطا فرمائے ہیں کیونکہ یہ اختیار حکمرانی ایک مقدس امانت ہے:

یہ دستور ساز اسمبلی جو پاکستان کے عوام کی نمائندہ ہے، آزاد و خود مختار ریاست پاکستان کے لیے ایک دستور وضع کرنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ ہر گاہ یہ ریاست اپنے اختیارات و حاکمیت عوام کے منتخب نمائندوں کے ذریعے بروئے کار لائے گی۔ جس کی رُو سے اصولِ جمہوریت، حریت، مساوات، رواداری، عدل و حکمرانی کو جس طرح اسلام نے ان کی تشریح کی ہے پورے طور پر ملحوظ رکھا جائے گا، جس کی رُو سے مسلمانوں کو اس قابل بنایا جائے گا کہ وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر خود کو اسلامی تعلیمات کے مطابق جو قرآن اور سنتِ رسول ﷺ میں متعین ہیں، تربیت دے سکیں۔ جس کی رُو سے اس امر کا واقعی اہتمام کیا جائے گا کہ اقلیتیں آزادی کے ساتھ اپنے مذہبی عقیدوں پر قائم رہ سکیں اور اپنی ثقافتوں کو ترقی دے سکیں۔

جس کی رو سے بنیادی حقوق کی ضمانت دی جائے گی جن میں حیثیتوں اور مواقع کی مساوات اور قانون کے مطابق معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی انصاف، آزادیِ فکر، آزادیٔ

اظہار، مذہب و عقیدہ، عبادت و تنظیم سازی اور تابعِ قانون اخلاقیات کی آزادی شامل ہے۔

جس کی رُو سے اقلیتوں اور پس ماندہ و پست طبقوں کے جائز حقوق کے تحفظ کا انتظام کیا جائے گا اور جس کی رُو سے نظام عدل کی آزادی کا ملاً محفوظ ہو گی۔

جس کی رو سے عدلیہ کی آزادی کی مکمل ضمانت دی جائے گی۔ پاکستان کے عوام اقوام عالم میں باوقار مقام حاصل کر سکیں اور وہ بین الاقوامی امن و ترقی اور انسانیت کی خوشیاں بڑھانے میں اپنا کردار ادا کر سکیں۔

اس قرار داد کو اس وقت کے تمام بڑے اسلامی مفکرین کی حمایت حاصل تھی جن میں سید ابو اعلیٰ مودودیؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ پیر مانکی شریفؒ اور دیگر علماء کرامؒ بھی شامل تھے۔ اس قرار داد کو اب بھی علماء کرامؒ اور اہل دانش کی حمایت حاصل ہے۔ باالفاظ دیگر پاکستان کے تمام علماء اور اہل دانش نے اجتماعی اجتہاد کے ذریعے پاکستان کی قومی ریاست کے تصور کو قبول کیا ہے۔ ایک عالمگیر اسلامی خلافت عہد حاضر میں نا ممکن ہے اور نہ ہی کبھی ایک عالمگیر اسلامی خلافت ممکن ہوئی ہے۔ اس لیے اس محال تصور کے لیے خون نہیں بہانا چاہیے بلکہ اچھی مسلم قومی ریاستیں بننی چاہیں جن کا باہمی بین الاقوامی روحانی و سیاسی اتحاد ممکن ہو سکتا ہے۔

حوالہ جات

1 Conflict and Conquest in the Islamic World: A Historical Encyclopedia, Edited by Alexander Mikaberidze. Santa Barbara: ABC-CLIO, 2011.

2 Reconstruction of Religious Thought in Islam by Dr. Muhammad Iqbal. London: Oxford University Press, 1934.

3 The End of the Jihad State: The Reign of Hisham Ibn 'Abd al-Malik and the Collapse of the Ummayyads by Khalid Yahya Blankinship. Albany: State University of New York Press, 1994.

4 The First Written Constitution in the World by Dr. Muhammad Hamidullah. Lahore: Ashraf Press, 1975.

سیاسی اسلام کا موقف اور مذہبی روایت کا متبادل بیانیہ

شمس الدین حسن شگری

شمس الدین حسن شگری نوجوان مصنف ہیں۔ وہ سیاسی اسلام سے جڑے موضوعات پر گہری دسترس رکھتے ہیں۔اس لیکچر میں انہوں نے سیاسی اسلام کی بنیادوں کی کھوج لاگائی ہے۔ مسلم دنیا، بالخصوص برصغیر میں اس کی اٹھان کیسے ہوئی۔ اس میں شیعہ سنی نظریات ایک دوسرے سے کیسے متأثر ہوئے اور یہ کہ کیا یہ بنیادیں اسلام کی حقیقی تعلیمات سے ہم آہنگ ہیں یا نہیں۔

دنیا کے تمام بڑے مذاہب کی تعلیمات کو عقائد یا ایمانیات، عبادات، اخلاقیات، فقہ یا قوانین، چار حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے،ان میں سے فقہ یا قوانین میں کچھ ایسے احکام ہیں جن کا تعلق فرد کے بجائے معاشرہ، نظم اجتماعی یا دوسرے الفاظ میں حکومت سے ہے۔ یعنی ان کے نفاذ کے لئے قوت نافذہ کی ضرورت ہے۔ اگر ہر شخص خود کو ان کا مخاطب اور مکلف سمجھ کر ان پر عمل کی کوشش کرے گا تو معاشرے میں انارکی اور بدامنی پھیلے گی۔ان احکام کی موجودگی سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔اور یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اس نوع کے احکام تمام مذاہب میں پائے جاتے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا انبیاء کرام کی بعثت کا مقصد حقیقی، مذہب کا بنیادی ہدف اور ایک مذہبی انسان کی زندگی کا نصب العین ان چند احکام و قوانین کے نفاذ کے لیے قوت نافذہ کا حصول ہے ؟ کیا قرآن مجید میں مذکور انبیاء کرام نے اپنی اپنی قوم کے سامنے اسی کو بطور مقصد بعثت بیان کیا ہے ؟ کیا اخلاقیات، عقائد اور عبادات وغیرہ اسی بنیادی مقصد کے حصول کے

زرائع ہیں؟ کیا باقی احکام کی تعبیر و تشریح اسی نصب العین کی بنیاد پر کی جائے گی؟ کیا خدا نے حصول جنت اور آسمانی بادشاہت کے حصول کے لیے انسان کی زندگی کا مقصد اور نصب العین اسی کو بتایا ہے؟ کیا تزکیہ باطن اور تزکیہ نفس کا مقصد بھی یہی ہے کہ دنیا میں سیاسی حاکمیت اور سیاسی بالادستی حاصل کی جائے اور پھر آخرت میں بطور انعام جنت کا حصول؟

عہدِ حاضر اور سیاسی اسلام

جب ہم قرآن مجید کی قدیم تفاسیر اور فقہ وکلام اور امامت و خلافت سے متعلق لکھی گئ کتابوں (مثلاً ماوردی کی،، اُلاحکاک السلطانیۃ، ابن قتیبۃ کی، اُلامامۃ والسیاسۃ، وغیرہ) کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں اسلام کی یہ تعبیر کہیں نظر نہیں آتی۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ رسول اللہ کو سیاسی قوت حاصل ہو گئی تھی اور بعد میں خلافت کا نظام بھی قائم ہوا اور کسی نا کسی شکل میں یہ نظام 1922 تک قائم بھی رہا۔ اس دور کے لٹریچر میں نصب امام یا تقرر خلیفہ کی فرضیت اور وجوب کی بحثیں نظر آتی ہیں جن کو ہمارے کچھ سیاسی اور انقلابی اسلام والوں نے بطور استدلال اختیار کیا ہے۔ مگر عہد صحابہ سے اسلام کی جدید سیاسی اور انقلابی تعبیر تک کسی نے قرآنی آیات سے اسلام کو بطور سیاسی نظام قائم اور غالب کرنے کا تصور پیش نہیں کیا۔ اور قرآنی آیات سے اس کو بطور نصب العین اور مسلمان کی زندگی کے مقصد اور ہدف کے طور پر پیش نہیں کیا۔

ہمارے برصغیر سمیت اور کئی علاقوں میں نو آبادیاتی نظام قائم ہوا اور مسلمان سیاسی طور پر زوال پذیر ہونا شروع ہوا اور اکثر مقامات پر مسلمانوں کو ایک اور غالب تہذیب کا

سامنا کرنا پڑا اور اسلام بلکہ پر اعتراضات کا سلسلہ شروع ہوا اور اسلام کو ایک غیر مہذب اور وحشیانہ مذہب کے طور پر پیش کرنے کیا جانے لگا۔ اسلام کے تصور جہاد و قتال، کچھ عائلی قوانین اور دیگر احکام کو بنیاد بنا کر اسے ایک انسان دشمن اور مخالف تہذیب مذہب کے طور پر پیش کیا گیا تو اس دور کے اہل علم نے بھی اسلام کو ایک سیاسی اور انقلابی نظام کے طور پر پیش کرنے کے بجائے ان اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش کی۔ اس میں کچھ اہل علم معذرت خواہانہ تعبیر کی طرف گئے اور اسلام کی ایک نئی تعبیر پیش کرنے کی کوشش کی۔ جبکہ کچھ اہل علم نے معذرت خواہانہ تعبیر کے بجائے موجود تعبیر پر اصرار کرتے ہوئے علمی و فکری اور مناظرانہ اسلوب اختیار کرتے ہوئے جواب دینے کی کوشش کی۔ محترمہ اقرا کرن صاحبہ نے اپنی کتاب ؛؛مطالعہ استشراق کے مناہج،، میں مستشرقین کو جواب دینے والوں کو، علمی و فکری اسلوب، مناظرنہ اسلوب اور اعتذاری اسلوب میں تقسیم کیا ہے۔

اسی دور میں خلافت عثمانیہ کا بھی مکمل خاتمہ کر دیا جاتا ہے جس سے مسلمانوں کو شدید جذباتی ٹھیس پہنچتی ہے۔ یہاں پہنچ کر مسلمانوں کا سیاسی زوال اپنے انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ اور پھر یہی وہ زمانہ ہے جب برصغیر میں بھی آزادی کی کرنیں طلوع ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ اسی دور میں دنیا بھر میں سوشلزم اور سرمایہ داری کے درمیان نظریاتی جنگ بھی چل رہی تھی اور غریب ممالک کے عوام، اہل دانش اور بادشاہتوں سے تنگ لوگ سوشلزم سے متاثر ہو رہے تھے۔ ان سب کے لئے انقلاب اور تبدیلی کی ایک راہ نظر آرہی تھی اور وہ راہ تھی مسلح جدوجہد کے زریعے بادشاہتوں اور نظام کہن کا خاتمہ۔

اسی لئے 19ویں صدی کو انقلابات اور نظاموں کی لڑائی کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ اس دور میں مذہب پر اعتراضات میں ایک بہت بڑے اعتراض کا اضافہ ہو جاتا ہے اور وہ ہے مذہب عوام کے لیے افیون ہے۔ مذہب نہ کوئی انقلابی نظام دیتا ہے اور نہ ہی انسان کے بنیادی مسائل کا کوئی حل پیش کرتا ہے۔ بلکہ مذہب تو ظالم اور بالا دست طبقے کے مفادات کا سب سے بڑا محافظ ہے۔ مذہب معاشی عدم مساوات کو نہ صرف برا نہیں سمجھتا بلکہ وہ اس عدم مساوات کا سب سے بڑا محافظ اور نگہبان ہے۔ مذہب کو اس موجودہ زندگی اور اس کے مسائل سے کوئی سروکار نہیں وہ اگلے جہاں کے سہانے خواب دکھا کر لوگوں کو لوریاں دیتا ہے۔ مذہب، حکومت اور حکمرانوں کی تبدیلی اور ظلم و ناانصافی کے خاتمے کا کوئی پروگرام نہیں دیتا۔

اس دور میں مستشرقین کے اسلام پر بطور مذہب اعتراضات بھی موجود ہیں مگر اس کی شدت میں کمی آجاتی ہے۔ مگر اعتراضات برقرار ہیں اسی لئے اس دور کے مفکرین ان اعتراضات کے جواب بھی دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مگر دوسری طرف انقلاب پسندوں اور کمیونزم سے متاثر لوگوں کی طرف سے اسلام اور دیگر مذاہب پر بطور نظام زندگی اعتراضات میں شدت آرہی تھی اور تعلیم یافتہ طبقہ ان اعتراضات سے بہت زیادہ متاثر بھی ہو رہا تھا۔ یہی وہ دور ہے جس میں سائنس اور سائنسیت کا غلبہ بھی نظر آتا ہے۔ سرسید، مفتی محمد عبدہ اور جوہری طنطاوی، علامہ پرویز، 1960 کے بعد کا اہل قرآن، ڈاکٹر طاہر القادری وغیرہ کی تفاسیر میں سائنسی منہاج فکر کو ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ سلسلہ کسی نا کسی شکل میں ابھی تک جاری ہے، اگرچہ شدت میں کمی ضرور آئی ہے۔ ان کے علاوہ بھی قران اور اسلام کی سائنسی تعبیر پر بہت مواد موجود ہے۔

مختصراً اس پورے عرصے کے اہم مسائل کو یوں بیان کر سکتے ہیں، ایک نئی تہذیب کے پیدا کردہ تہذیبی مسائل، اس نئی تہذیب اور اس سے متاثرہ لوگوں کی طرف سے اسلام کو ایک غیر مہذب مذہب بنانے کی کوشش، جدید تعلیم یافتہ طبقے کا اس سے متاثر ہونا، اس تہذیب کے پیدا کردہ سوالات کے جواب دینے والے جدیدیت پسند، سائنس اور سائنسیت کے پیدا کردہ مسائل اور بالکل آخر میں کمیونزم والوں کے اسلام سمیت تمام مذاہب پر شدید تنقید اور اعتراضات اس آخری دور میں ایک طرف یہ شدید اعتراضات تھے اور دوسری طرف ہندوستان میں تاج برطانیہ کا سورج غروب ہو رہا تھا اور آزادی کی تحریک عروج پر تھی اور مسلم لیگ ایک الگ مسلم ریاست کے تصور پر سرگرم عمل تھی اور اس کی بنیاد اسلام کو بنایا ہوا تھا یعنی ایک اسلامی ریاست کا تصور اس وقت تک مسلمان اہل دانش کی طرف سے ایسا کوئی ٹھوس علمی اور سیاسی کام بھی موجود نہیں تھا۔ اس تصور پاکستان کی مخالفت میں علماء کا ایک بہت بڑا طبقہ بھی بطور چیلنج موجود تھا۔

اس پس منظر میں اسلام کی سیاسی اور انقلابی تعبیر کا سورج طلوع ہوتا ہے۔ اسی لئے اس دور کے مفکرین ان تمام مسائل سے نبرد آزما نظر آتے ہیں۔ چونکہ اعتراضات کی شدت نظام نہ ہونے، انقلابی پروگرام نہ دینے، اور انسان کے معاشی اور سیاسی مسائل کو نظر انداز کرنے پر زیادہ ہے اس لیے ہمیں آزاد خیال اہل علم کی تفاسیر اور تعبیر دین میں انقلاب اور نظام کا تصور بہت گہرا اور نمایاں نظر آتا ہے۔ اس دور کے جن اہل علم و دانش نے اسلام کو بطور انقلابی تحریک اور سیاسی نظام پیش کیا انہوں نے اس کے لئے کچھ آیات سے استدلال کیا ہے۔ ان حضرات کے نزدیک اسلام کا مزاج اور مقصد معاشرے میں سیاسی انقلاب برپا کرنا اور ایک اسلامی ریاست کا قیام عمل میں لانا ہے۔ اور بندہ مومن

کی زندگی کا مقصد، مشن، منتہی اور نصب العین اسی ہدف اصلی کا حصول ہے۔ اس تعبیر کی رو سے قرآن مجید کی بہت ساری اصطلاحات اور الفاظ کا مفہوم بھی سیاسی اور انقلابی بن جاتا ہے۔ مثلا الہ، رب، دین، عبادت، جہاد و قتال، اظہار دین حق، جاہلیہ، طاغوت وغیرہ، اور قرآن میں بیان کئے گئے شرعی احکام، تزکیہ نفس، عقائد اور عبادات وغیرہ کا مقصد بھی یہی بن جاتا ہے کہ یہ اس نصب العین اور مقصد زندگی کے حصول کے زرائع بن جائیں۔ اسی تعبیر دین کو سیاسی اور انقلابی اسلام کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

اسلام کی سیاسی اور انقلابی تعبیر کی ابتداء

جب بھی کسی نظام فکر و فلسفہ کی بنیاد کسی متن پر رکھی جائے گی تو اس میں تعبیر کا اختلاف واقع ہو گا۔ اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ اس سے انکار کی گنجائش نہیں۔ مذہبی متون کی نمایاں مثالیں قرآن، تورات، زبور، انجیل، اوستا اور وید ہیں۔ جب انسان اس متن کی تفہیم و تشریح کی کوشش کرتا ہے تو تعبیر کا اختلاف وجود میں آتا ہے۔ تعبیر کا یہ اختلاف ہمیں دنیا کے ان تمام بڑے مذاہب کے ہاں نظر آتا ہے جن کے پاس اپنے مذہبی مؤسس کی کتاب یا متن موجود ہے۔ تعبیر کا یہ اختلاف مذہبی متن کے علاوہ ان متون میں بھی نظر آتا ہے جن میں انسان کے بنیادی سوالوں کے جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ چاہے وہ متن شاعری کی صورت میں ہو یا پھر نثر کی۔ تعبیر کا یہ اختلاف مذہبی، فلسفیانہ اور صوفیانہ متون میں زیادہ نظر آتا ہے۔ یہ کوئی معیوب اور قابل مذمت بات نہیں ہے۔ قرآن مجید بھی ایک مذہبی متن ہے اور مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق یہ خدا کی طرف سے انسانوں کی ہدایت کا آخری مستند ہدایت نامہ ہے۔ نزول قرآن کے

وقت سے آج تک اس متن کی تفہیم و تشریح کا سلسلہ جاری ہے۔ اور اس انسانی تفہیم کی کوشش کو ہم قرآن کی تفسیر کے نام سے جانتے ہیں۔ قرآن کا متن مکمل محفوظ اور داخلی تضاد سے پاک ہونے کے باوجود ہمیں اس کی تعبیر و تشریح میں بہت اختلاف نظر آتا ہے۔ ہر مفسر اپنے زمانے کے علمی اور فکری مسائل سے آگاہ ہوتا ہے اور متن کی تفسیر وہ اپنے دور کے انسانوں کے لیے کر رہا ہوتا ہے اس لئے ہمیں تفاسیر میں مفسرین کے ذاتی، علمی، فکری رجحانات اور اس دور کے علمی و فکری اثرات بھی نظر آتے ہیں۔ کسی تفسیر میں زیادہ کسی میں کم۔ لیکن اپنے دور کے اثرات سے مبرا کوئی بھی تفسیر نہیں۔ اسی لیے تفسیر کا یہ سلسلہ آج بھی جاری و ساری ہے اور کسی مفسر نے اپنی تفسیر کو خاتم التفاسیر نہیں کہا۔ اسی طرح قرآن مجید میں چونکہ مختلف موضوعات اور مسائل زیر بحث آئے ہیں اس لئے مفسر کے علمی ذوق اور اس دور کے اثرات کے مطابق ہمیں تفسیر کی مختلف اقسام ملتی ہیں۔ مثلاً فقہی، کلامی، اشاری، سائنسی تفاسیر کی اقسام کا ذکر علوم القرآن کی تمام کتابوں میں ہمیں ملتا ہے۔ محدثین کے منہج کے پیروکار مفسرین کے ہاں اصولی طور پر کوئی ایک تفسیر ہونی چاہئے جو قیامت تک متفقہ علیہ ہو اور جسے خاتم التفاسیر کہا جا سکے مگر عملاً ایسا نہیں ہے۔

جیسا کہ ابھی میں نے ذکر کیا کہ اٹھارہویں، انیسویں اور بیسویں صدی چونکہ سائنس اور سائنسیت نیز نظاموں کی لڑائی کا زمانہ ہے اس لئے اب تفسیر کی ایک نئی قسم ہمیں نظر آتی ہے جسے ہم سیاسی، انقلابی تفسیر اور سائنسی تفسیر کہہ سکتے ہیں۔ اس قسم کی تفسیر کا رجحان ہمیں زیادہ تر ان اہل علم کے ہاں نظر آتا ہے جو آزاد خیال سمجھے جاتے ہیں۔ مگر باقی اہل علم بھی اس سے مکمل طور پر آزاد نظر نہیں آتے۔ آزاد خیال اہل علم کے ہاں

اگرچہ اس کے اثرات زیادہ نظر آتے ہیں۔ چونکہ میرا موضوع سیاسی اسلام ہے اس لیے میں اپنی گفتگو اسی تک محدود رکھوں گا۔

اس تعبیر کو بہت مدلل انداز میں جس شخصیت نے سب سے پہلے پیش کیا ہے ان کا اسم گرامی بین الاقوامی سطح پر معروف شخصیت، سید ابو الاعلی مودودی مرحوم ہیں۔ (1903-1979) سید صاحب مرحوم نے اس کے لیے اسلامی نظام، اسلامی حکومت، حکومت الہیہ، فریضہ اقامت دین، شہادت علی الناس وغیرہ جیسی تراکیب استعمال کی ہیں۔ اسی سیاسی اور انقلابی تعبیر کی زیادہ انتہا پسندانہ تعبیر ہمیں علامہ غلام احمد پرویز مرحوم (1903-1985) کے ہاں نظر آتی ہے۔ پرویز صاحب چونکہ بہت زیادہ بدنام اور معتوب ہوئے اس لیے ان کا بہت زیادہ اثر ہمیں نظر نہیں آتا اسی لئے ہمارے ہاں اس قسم کے موضوعات پر گفتگو کرتے ہوئے ان کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح اس فہرست میں، مولانا عبید اللہ سندھی (1872-1944)، علامہ اقبال (1877_1983 مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی (1901-1962) وغیرہ کو بھی شامل کر سکتے ہیں۔ یہ تینوں بزرگ اسلامی نظام کے قائل تھے اور تینوں کا فہم دین سوشلزم کے قریب ہے۔ مولانا سندھی کو ایک خاص مقام حاصل ہے جنہوں نے اسلام کی انقلابی تعبیر پیش کی۔ اسلام کی مکمل انقلابی، سیاسی اور معاشی تعبیر ہندوستان میں جن لوگوں نے پیش کی ان میں سر فہرست مولانا سندھی کی شخصیت بھی ہے۔ مولانا سندھی نے قرآن مجید کی انقلابی تفسیر بھی لکھنے کی کوشش کی۔ بہت ساری سورتوں کی تفسیر چھپی ہوئی موجود ہے، مثلاً قرآنی شعور انقلاب، تفسیر المقام المحمود،، وغیرہ، مگر مولانا سندھی کی تعبیر کافی حد تک انقلابی اور معاشی ہے۔ بلکہ سوشلزم کے معاشی نظام کو قرآنی آیات سے ثابت کرنے

میں آپ کو اولیت حاصل ہے۔ اسی لئے ان کی تعبیر اسلام کو اسلامک سوشلزم کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ آپ کی توجہ معاشی مساوات کو قرآن سے ثابت کرنے کی طرف زیادہ رہی ہے۔ محترم شیخ محمد اکرام اپنی کتاب،، موج کوثر،، میں عبیداللہ سندھی کی فکر کو مغربی مادیت اور مشرقی روحانیت کا امتزاج قرار دیتے ہیں۔ تاہم مولانا عبید اللہ سندھی، سید ابوالاعلی اور دیگر سیاسی اور انقلابی اہل علم کی طرح اسلام ک، مکمل سیاسی تعبیر نہیں کرتے ان کی زیادہ توجہ سوشلزم اور کمیونزم کے پیش کردہ اعتراضات کی طرف زیادہ نظر آتی ہے، مگر وہ سوشلزم کو مکمل رد نہیں کرتے اس کے متاثر کن حصوں کو قرآن کے عین مطابق قرار دیتے ہیں اور ایک عالمگیر انقلاب جو کسی مخصوص قوم یا ملک کے لے نہ ہو بلکہ کل انسانیت کے لے ہو اور معاشی مساوات کو وہ قرآن مجید سے ثابت کرتے ہیں۔ اسی طرح اسلامی جہاد کو وہ انقلاب اور تبدیلی کا زریعہ سمجھتے ہیں۔ اسی طرح ایک اور روایتی عالم دین مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی نے بھی اسلام کے معاشی نظام اور مزدور اردو محنت کش کے حقوق اسلامی تعلیمات کی روشنی میں مبرہن کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مولانا خود سیاسی طور پر کانگریس کی طرف تھے۔

مولانا سندھی یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ راسخ العقیدہ اور روایتی مسلمان عوام اور علماء کے ہاں اس تعبیر کو زیادہ پزیرائی نہیں ملے گی، اسی لیے آپ نے اپنی ہر تعبیر کو شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (1703- 1762) کی طرف منسوب کر کے بیان کرنے کی کوشش کی۔ پھر بھی آپ کی تعبیر کو بہت زیادہ پزیرائی نہیں ملی۔ آج کے پاکستان میں جمیعت علماء اسلام اپنے آپ کو شاہ ولی اللہ اور مولانا سندھی کے افکار کے وارث کے طور پر پیش کرتی ہے اسی لیے جمیعت علماء اسلام کی تعبیر اسلام میں معاشی اور سماجی اصلاحات

اور عوامی حاکمیت اور جمہوریت کی طرف توجہ زیادہ نظر آتی ہے۔ یہاں جن بزرگوں کی طرف اشارتا بات کی گئی ہے ان کا بہت زیادہ اثر بھی نہیں ہوا اور ان بزرگوں کا جو کچھ تھوڑا بہت اثر نظر آتا ہے وہ علاقائی حد تک محدود ہے اور اس فکر کی بنیاد پر آج تک کوئی ایسی تحریک بھی نہیں اٹھی جس نے اسلامی نظام کے قیام کے لئے مسلح جدوجہد کا راستہ اختیار کیا ہو اور نہ ہی اس تعبیر کے علمبرداروں کو کہیں اپنی تعبیر اسلام کو آزمانے کا موقع ملا۔

اسی طرح علامہ اقبال کی شاعری میں بھی اسلام کی انقلابی تعبیر کی واضح جھلک نظر آتی ہے۔ مگر نثری لٹریچر میں اس طرف خاص توجہ نظر نہیں آتی۔ پہلی نثری کتاب،، علم الاقتصاد،، میں بھی اسلام کو بطور معاشی اور سیاسی نظام پیش کرتے ہوئے نظر نہیں آتے۔ اسی طرح خطبات اقبال میں بھی صرف چھٹا خطبہ ہے جہاں ان کی سیاسی فکر نظر آتی ہے مگر وہاں ان کا زور اجتہاد پر نظر آتا ہے جس کو ہمارے روایتی مذہبی فکر والے قبول نہیں کرتے۔ اسی خطبے میں انہوں نے روحانی جمہوریت کی اصطلاح بھی استعمال فرمائی ہے۔ علامہ اقبال کی جو سیاسی فکر ہے وہ ایک مفکر، فلسفی اور دانشور کی فکر ہے وہ مفسر قرآن اور شارح اسلام نہیں تھے کہ آیات قرآنی اور احادیث رسول سے استدلال کرتے۔ ان کے دیگر افکار کی طرح سیاسی فکر کے لئے ایک اہم ماخذ ان کے مکاتیب اور خطوط ہیں۔ علامہ اقبال کو پڑھتے ہوئے ان کے فکری سفر اور فکری تبدیلیوں اور ارتقاء کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ خود ماہرین اقبال کے ہاں بھی آپ کے مختلف نظریات اور تصورات کے حوالے سے شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔

اس دور کے کچھ اور بزرگوں کا نام بھی لیا جاتا ہے مثلاً اسی سیاسی اور انقلابی فکر کے ایک زبردست شارح ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم اپنی کتاب،، خلافت کی حقیقت اور عصر حاضر میں اس کا نظام،، میں لکھتے ہیں۔

؛، میں بارہا عرض کر چکا ہوں کہ مجھے احیائے اسلام کا ایک مبہم جذبہ تو اولاً علامہ اقبال کی ملی شاعری سے ملا تھا۔ لیکن اس خاکے میں تحریک اور اس کے لوازم وخدوخال کا رنگ مولانا مودودی کی تحریروں کے زریعے بھرا گیا۔ مولانا مرحوم نے جماعت اسلامی کی تاسیس کے موقع پر اپنے،، نصب العین،، کی تعبیر،، حکومت الہیہ،، کی اسی اصطلاح سے کی تھی جس کا استعمال اولاً مولانا ابوالکلام آزاد اور پھر ان کے بعد خیری برادران اور علامہ مشرقی نے کیا تھا۔ لیکن بعد ازاں جب جماعت اسلامی میں مولانا امین احسن اصلاحی کی شمولیت کے بعد ان کے قرآنی فکر کا دھارا بھی مولانا مودودی کے افکار کے دھارے میں شامل ہو گیا تو اس وقت اس کی تعبیر کے لے خالص قرآنی اصطلاحات یعنی شہادت علی الناس،، فریضہ اقامت دین اور غلبہ دین حق کا استعمال عام ہو گیا،،۔(1)

یہ ہیں وہ چند اہل دانش جن کا نام اسلام کی جدید سیاسی تعبیر کے حوالے سے لیا جاتا ہے۔ ان میں سب سے نمایاں، اور سیاسی اسلام کے بانی اور مؤسس کے طور پر معروف نیز جدید مسلم فکر کو سب سے زیادہ متاثر کرنے والی شخصیت کا نام سید ابو الاعلی مودودی مرحوم ہے۔ آج دنیا بھر میں یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم ہی نے اس تصور کو پروان چڑھایا ہے اور اس کو بہت مدلل انداز سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی لئے قومی اور بین الاقوامی سطح پر آپ ہی کا نام معروف ہے۔ سید مودودی مرحوم نے پورے قرآن مجید کی اسی فکر کے مطابق تفسیر بھی لکھی۔

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کے سابق استاد فلسفہ محترم احمد محمد جاد صاحب اپنے پی ایچ ڈی مقالے میں لکھتے ہیں۔

؛، حاکمیت کی اصطلاح ہندوستان کے مسلم مفکرین کے ہاں 1930 سے 1940 کے زمانے میں ظاہر ہوئی۔۔۔ پھر مودودی کی تحریروں سے یہ نظریہ سید قطب کے ہاں پہنچا اور پھر ان سے اسلامی احیائی تحریکوں کی طرف منتقل ہوا۔ یہ تقریباً 70 کی دہائی میں ہوا۔ اس دور کی احیائی تحریکوں کی قیادت اپنی نسبت سید مودودی اور سید قطب کی طرف کرتی تھی۔ مثال کے طور پر جماعت التکفیر والہجرہ اور جماعت الجہاد وغیرہ،،۔(2)

ایک اور عرب عالم دین ابو حسام الدین طرفاوی کا بھی یہی خیال ہے کہ اسلام کی سیاسی تعبیر کی ابتداء مولانا مودودی نے کی، خدا کی سیاسی حاکمیت کا تصور انہوں نے پیش کیا، مودودی صاحب سے یہ تصور سید قطب اور دیگر اہل عرب نے لیا، طرفاوی صاحب نے اپنی مختصر کتاب،،الغلو في التكفير المظاهر.الأسباب.العلاج میں اس پر تفصیلی بحث کی ہے۔ موصوف نے سید مودودی کی کتاب،، قرآن کی چار بنیادی اصطلاحات،، کو بنیاد بنا کر مودودی صاحب کے سیاسی تصور اسلام، ان کے منہج اور اس منہج کے نتائج پر بحث کی ہے۔ طرفاوی کا خیال ہے کہ سید مودودی نے اپنی تحقیق کی بنیاد کے لیے عربی لغت کا سہارا لیا۔ قرآن کی ان آیات پر توجہ مرکوز کی جن سے ان کی تعبیر کی تائید ہوتی ہے اور آیات کو سیاق سے ہٹا کر پیش کیا۔ سید مودودی نے فہم سلف کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ یہ منہج استدلال اہل بدعت کا ہے۔ اس منہج سے سید قطب متاثر ہوئے اور انہوں نے اپنی تفسیر،، فی ظلال القرآن،، میں اس کتاب سے بہت کچھ نقل کیا اور اس میں بہت سے اضافے کئے۔ (3)

مولانا وحید الدین خان صاحب کا بھی یہی موقف ہے کہ اسلام کی یہ سیاسی تعبیر گذشتہ صدی کی پیداوار ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

"سید جمال الدین افغانی، حسن البناء سید قطب، محمد اقبال، آیۃ اللہ خمینی، سید ابوالاعلی مودودی جیسے بہت سے لوگوں نے اسلام کا پولیٹیکل انٹرپریٹیشن کر کے انہیں باور کرایا ہے کہ اسلام کا سب سے بڑا عمل جہاد ہے..... حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلے کا واحد حل یہ ہے کہ اسلام کی غلط تعبیر پر قائم شدہ اس پولیٹیکل آئیڈیالوجی کو ڈسٹرائے کیا جائے (4)

یہی نقطہ نظر سید اسامہ محمود ازہری، قاضی جاوید، جناب خورشید احمد ندیم، سید حسین نصر اور بینظیر بھٹو شہید وغیرہ کا بھی ہے۔

جمہور سنی مسلمان اگرچہ نظام خلافت سے ایک جذباتی اور رومانوی وابستگی رکھتے ہیں اور وہ اس کو آج بھی مسلمانوں کے لیے ایک بہترین اور آئیڈیل نظام تصور کرتے ہیں۔ مگر روایتی علماء نے نظام خلافت یا اسلامی نظام کو ثابت کرنے اور اسلام کو انقلابی نظام ثابت کرنے کے لئے ان آیات اور اصطلاحات سے استدلال نہیں کیا جن سے جدید اور آزاد خیال اہل علم نے کرنے کی کوشش کی۔ پھر روایتی علماء کے ہاں تقرر خلیفہ کے وجوب کی بحث جو ملتی ہے اس کا تناظر ان جدید مفکرین کے بیان کردہ ہدف اصلی اور نصب العین زندگی سے بالکل مختلف ہے۔ اگرچہ اب ہمیں روایتی علماء کے ہاں بھی اس کے اثرات نظر آتے ہیں۔ اس حوالے سے ممتاز دانشور محترم خورشید ندیم صاحب اپنی کتاب،، سیاسی اسلام،، میں یہ بتانے کے بعد کہ دور جدید کی غالب تعبیر اسلام سیاسی تعبیر اسلام

ہے اور اس وقت مسلم معاشروں میں انتہا پسندی کی جو لہر ہے اس کی فکری بنیادیں بھی سیاسی اسلام میں ہیں، لکھتے ہیں۔

''اس کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ روایتی دینی فکر کے علمبردار حلقے نے اگرچہ مولانا مودودی کے افکار اور علمی حیثیت کو فی الجملہ مسترد کر دیا لیکن اس وقت یہ حلقہ بھی بالفعل اسی فکر کو قبول کیے ہوئے ہے۔ اس نے ان اصطلاحات کو شعوری یا غیر شعوری طور پر اختیار کر لیا ہے جو سیاسی اسلام کے تحت تشکیل پزیر ہوئیں۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ تنقید کے باوجود روایتی دینی حلقہ اس فکر کی پوری تفہیم سے قاصر رہا۔ بہت کم لوگ اس کی حقیقت کو جان سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اس حلقے نے سیاسی اسلام کی اصطلاحوں کو تو قبول کیا، اس کے مغز تک رسائی حاصل نہ کر سکا،،۔(5)

ہمارے روایتی علماء بھی اگرچہ اسلامی نظام اور نظام خلافت کے بھرپور حامی ہیں اور وہ اس نظام کے قیام اور احیاء کو بہت اہم سمجھتے ہیں مگر رویتی تعبیر دین میں علمی طور پر راسخ اور صف اول کے علماء کو اس سیاسی تعبیر سے اختلاف ہے جس کی نظیر گزشتہ چودہ سو سالوں میں نہیں ملتی۔ اس جدید تعبیر کو ماننے سے کیا خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور اسلامی احکام کی ترتیب پر کیا اثر مرتب ہوتا ہے اسے مفتی تقی عثمانی صاحب کی زبانی ملاحظہ فرمائیں۔ مفتی صاحب نے اپنی کتاب،، اسلام اور سیاسی نظریات،، میں صفحہ نمبر 194 سے 202 تک اس تصور پر بحث کی ہے۔ مفتی صاحب لکھتے ہیں۔

؛، دوسری انتہا پسندی بعض ایسے افراد نے اختیار کر لی ہے جنہوں نے سیکولرازم کی تردید اس شدت کے ساتھ کی کہ سیاست ہی کو اسلام کا مقصد اصلی قرار دیا، یعنی یہ کہا کہ اسلام

کا اصل مقصد ہی یہ ہے کہ دنیا میں ایک عادلانہ سیاسی نظام قائم کیا جائے اور اسلام کے باقی سب احکام اس مقصود اصلی کے تابع ہیں۔ لہذا جو شخص سیاست کے میدان میں دین کی سربلندی کے لئے کام کر رہا ہے، بس وہ ہے جس نے دین کے مقصود اصلی کو پالیا ہے۔،، زرا آگے چل کر لکھتے ہیں،، لیکن تنہا اس کو دین کا اصل مقصود قرار دینے سے ترجیحات کی پوری ترتیب الٹ جاتی ہے۔ کیوں کہ اگر یہ بات ذہن میں بیٹھ جائے کہ دین کا اصل مقصد سیاست و حکومت ہے تو اس ذہنیت سے متعدد خرابیاں جنم لیتی ہیں،،۔(6)

اس کے بعد مفتی صاحب نے مندرجہ ذیل خرابیاں گنائی ہیں۔

1: جب سیاست مقصود اصلی ہو گئی تو باقی ساری چیزیں اس کی تابع ہو گئیں۔

2: سب عبادتیں اس اعلیٰ مقصد یعنی سیاست و حکومت حاصل کرنے کے زرائع ہیں۔

3: ان ذیلی مقاصد میں سے کسی کی قربانی دینی پڑ جائے تو کوئی حرج نہ سمجھا جائے۔

4: جو لوگ عبادت وغیرہ میں مشغول رہتے ہیں، انہیں دین کے اصل مقصد سے غافل سمجھا جاتاے ہے، بلکہ بعض اوقات ان کی تحقیر اور ان کے ساتھ استہزاء کا معاملہ کیا جاتا ہے۔

5: اس تصور کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے دنیا میں جتنے انبیاء کرام تشریف لائے، ان کی اکثریت دین کے اصل اور بنیادی مقصد کو پورا کرنے میں ناکام رہی۔

مفتی تقی عثمانی صاحب نے اس تعبیر کی جو خرابیاں بتائی ہیں وہ آپ کسی بھی ایسے شخص کی تحریروں میں ملاحظہ کر سکتے ہیں جو اس تعبیر کا قائل ہے۔ اس کی کچھ مثالیں طالب علم کی کتاب،، مذہبی انتہا پسندی،، اور جناب خورشید ندیم صاحب کی کتاب،، سیاسی اسلام میں ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

برصغیر میں جن دیگر علماء اور اہل دانش نے اس تعبیر کا تنقیدی جائزہ لیا ہے ان میں مولانا اشرف علی تھانوں، ابوالحسن ندوی، مفتی تقی عثمانی، مولانا وحید الدین خان اور جاوید احمد غامدی صاحب شامل ہیں۔ ان میں سے سب سے زیادہ تنقید کرنے والی شخصیت مولانا وحید الدین خان مرحوم کی ہے۔ اپنے کچھ دیگر خیالات اور افکار کی وجہ سے آپ روایتی علماء اور سیاسی تعبیر والوں دنوں کے لئے قابل قبول نہیں ہیں۔ اس وقت پاکستان میں سیاسی اسلام پر تنقید کے حوالے سے سب سے توانا آواز ممتاز دانشور محترم خورشید ندیم صاحب کی ہے۔

سیاسی اسلام کے شیعہ و سنی کے فکر پر اثرات

سنی دنیا میں اسلام کی سیاسی تعبیر پیش کرنے والوں کا تعلق روایتی دینی علماء سے نہیں ہے۔ یہ سب وہ لوگ ہیں جنہوں نے عصری علوم کی درسگاہوں سے تعلیم حاصل کی اور پھر اپنے ذاتی شوق سے دین فہمی کی طرف آئے۔ سید مودودی، غلام احمد پرویز، ڈاکٹر اسرار احمد اور سید قطب وغیرہ نمایاں نام ہیں۔ اسی لئے ان حضرات کو روایتی علماء کی طرف سے تنقید کا سامنا رہا۔ مگر سیاسی اسلام کی تعبیر نے کافی حد تک دوسرے اور تیسرے درجے کے روایتی علماء کو ضرور متاثر کیا۔ اپنے روایتی علوم میں راسخ علماء نے اس

تصور پر تنقید بھی کی اور اسے رد بھی کیا۔ اسی طرح معاصر جہادی، احیائی تحریکوں جن کا مطمح نظر اسلام کو بطور نظام غالب کرنا ہے، ان پر سیاسی اسلام کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ سلفی تنظیم داعش اور دیوبندی تنظیم تحریک طالبان پاکستان اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ البتہ افغان طالبان ابھی تک روایتی مذہبی فکر سے جڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسی لئے پاکستان کے اکثر اسلام پسند جو سیاسی اسلام کے حامی ہیں بلا تفریق مسلک ا افغان طالبان کے حامی نظر آتے ہیں، البتہ تحریک طالبان پاکستان کے حوالے سے یہ لوگ کافی عرصہ کنفیوژن کا شکار رہے ہیں۔

جدید اور معاصر تحریکیں اس سیاسی تعبیر اسلام سے کہاں تک متاثر ہیں اس کا تفصیلی جائزہ لینا یہاں ممکن نہیں اس لئے صرف دو مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

تحریک طالبان پاکستان کے حلقہ درہ آدم خیل و پشاور کے امیر عمر منصور نے چارسدہ یونیورسٹی پر حملہ کرنے کے بعد جو ویڈیو پیغام جاری کیا اس میں انہوں نے جو کچھ کہا تھا اس میں موصوف مکمل طور پر سیاسی اسلام کی ترجمانی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس پیغام میں انہوں نے کہا تھا۔

؛، پہلی بات یہ ہے کہ پاکستان کے جعلی حاکموں نے آدھی صدی سے زیادہ عرصہ اللہ کی حاکمیت کو چیلنج کر رکھا ہے اور اللہ نے ان کو حاکمیت الہیہ قائم نہ کرنے پر مختلف شکلوں میں تنبیہ کی۔۔۔۔ تو اگر اہل پاکستان نے بھی شرک و جمہوریت سے توبہ نہ کی تو پنجاب اور سندھ میں بھی خیبر پختون خواہ کی طرح عذاب الہی کا انتظار کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے کہ جو ملک عمومی شرک میں مبتلا ہو جائے تو ان کی ہلاکت کے لیے عذاب بھی

عمومی نازل ہوگا۔ میں انتہائی سنجیدگی سے کہتا ہوں کہ باچا خان یونیورسٹی سے اس مبارک کام کی ابتداء اس لئے کی کہ پاکستان کے طاغوتی نظام، پاکستان کے جمہوری نظام، پاکستان کی عسکری قیادت اور پاکستان کی سیاسی قیادت کی یہی بنیاد ہے۔۔۔۔ پھر وہ لوگ اللہ کے قانون کے مقابلے میں قانون بناتے ہیں، پاک فوج کا خبیث ادارہ اس سے بنتا ہے۔۔۔۔ پھر یہ پورا ادارہ ان لوگوں کے خلاف کھڑا ہے جنہوں اللہ کی حاکمیت کی آواز بلند کی ہے، جب تک یہ بنیاد ختم نہ ہو جائے اور اللہ کی حاکمیت نافذ نہ ہو جائے تب تک پورے پاکستان میں اللہ کے فضل و کرم سے تمام کالجوں، یونیورسٹیوں اور اسکولوں پر ہمارے حملے جاری رہیں گے، پاکستان میں سارا نظام کفریہ ہے، سارا نظام جمہوری ہے، سارا نظام طاغوتی ہے، آرمی پبلک اسکول واقعے کے بعد حکومت نے قومی ایکشن پلان تیار کیا جو اکیس نکات پر مشتمل تھا، تو اس پر پاکستان کیوں کافر نہیں ہوتا، انشاءاللہ ہم یہ نظام درہم برہم کرنا چاہتے ہیں، اس بنیاد کو ختم کرنا چاہتے ہیں اور اللہ کا نظام قائم کرنا چاہتے ہیں، اللہ کی حاکمیت نافذ کرنا چاہتے ہیں،،۔

عالمی جہاد کا داعی رسالہ حطین کے شمارہ اول میں مولانا محمود حسن کا ادارتی مضمون ''دنیا کے نئے نقشے کی تعمیر'' میں موصوف نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ مختصراً نکات کی صورت میں پیش خدمت ہیں۔

1 عثمانی خلافت کے خاتمے اور امت کے زوال کے بعد دو قسم کی تحریکات وجود میں آئیں (1) نظریہ قومیت کی عملبردار اسلامی تحریکات (2) نفاذ اسلام اور اقامت دین کی تحریکات

2- پہلی قسم کی تحریکات کو اسلام کے عقائد واحکامات سے کوئی غرض نہ تھی۔ مثلاً سید جمال الدین افغانی، طہ حسین، حسین ہیکل، لطفی سید، سر سید احمد خان، آل انڈیا مسلم لیگ وغیرہ

3- جبکہ دوسری قسم کی تحریکات نفاذ دین کی تحریکات تھیں، اس لیے یہ اسلام اور اسلامی تعلیمات کے عین مطابق تھیں۔ ان میں حسن البناء، سید قطب، الاخوان، الجزائر میں شیخ عبدالحمید بن باریس کی جمیعۃ العلماء الجزائرئیین، برصغیر میں علمائے دیوبند کی جمعیت علماءاور جماعت اسلامی وغیرہ شامل ہیں۔

4- ان میں سے کچھ نے انتخابات کا راستہ اپنایااور کوئی کامیابی نہ ملی جبکہ کچھ نے جہاد وقتال کا راستہ اپنایااور کامیابیاں حاصل کیں۔

5- جب عالمی جہاد شروع ہوا تو چار قسم کے دشمن ہمارے سامنے آئے (1) امریکہ، اسرائیل اور یورپی بلاک (2) روس (3) ایران کی کی قیادت میں رافضی قیادت (4) مرتد حکمران اور افواج۔ جہاد کے تین محاذ کھل گئے (1) وہ علاقے جہاں مغرب کا تسلط کبھی نہیں رہا تھا، افغانستان، صومالیہ، یمن، صحرائے کبری اور شام (2) وہ ممالک جو انیسویں اور بیسویں صدی میں مغربی تسلط میں رہے جیسے پاکستان، الجزائر، لیبیا، مصر اور سعودی عرب وغیرہ (3) تیسرا محاذ مغربی ممالک جہاں مجاہدین نے کاروائیاں شروع کیں۔

6- جہاد ہی اقامت دین کا شرعی ذریعہ ہے، لہذا پر امن جمہوری جدوجہد کی علمبردار تنظیموں کو بھی اس طرف آنا چاہیے۔

7- لال مسجد تحریک کا مقصد بھی ملک میں نفاذ شریعت تھا مگر مرتد حکمرانوں نے اس کو برداشت نہیں کیا۔

8- اس آپریشن نے سب علماء کرام کو یقین دلا دیا کہ اس ملک میں نفاذ شریعت ممکن نہیں اس لیے یہاں کے دینی طبقے نے نیا رخ اختیار کیا اور پاکستان میں مسلط نظام، حکمرانوں اور فوج کے خلاف قتال کا آغاز ہو گیا۔

9- حکومت پاکستان نے ضرب عضب کے نام سے فیصلہ کن آپریشن شروع کر کے نفاذ شریعت کے لیے جدوجہد کرنے والوں کو مکمل ختم کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔

10- ہمیں یقین ہے کہ یہ آپریشن وغیرہ پانی کا بلبلہ ہے۔

11- جیسے ہی افغانستان میں امارت اسلامیہ مضبوط ہوئی، ویسے ہی پاکستان میں نفاذ شریعت کی تحریک دوبارہ زور پکڑے گی۔

12- پاکستان میں نظام کفر کے خلاف قتال کرنے والے تو وہ اسی نظریے کے تحت قتال کر رہے ہیں جس پر پاکسان کا قیام عمل میں آیا تھا۔

13- جمہوری جدوجہد سے پاکستان میں اسلام کا نفاذ کبھی بھی نہیں ہو گا۔ اس لیے پرامن جدوجہد کرنے والی تنظیموں کو چاہیے کہ عالمی جہاد کا حصہ بنیں تاکہ اسلامی نظام نافذ ہو سکے۔

14- ہم نے اس مضمون میں واضح کیا ہے کہ مسلم خطوں میں اسلامی تحریکات کا مقصد نفاذ اسلام رہا ہے اور مقتدر طبقے ہمیشہ اس کی راہ میں رکاوٹ بنے رہے ہیں۔ ایک عرصے تک پرامن جدوجہد کے بعد آج اسی مقصد کے حصول کے

لیے قتال کا دروازہ کھلا ہے۔ پاکستان کا بھی یہی معاملہ ہے۔ اسلام کے نام پر بننے والے ملک میں اسلام نافذ نہیں کیا گیا۔ اس کی راہ میں ہمیشہ رکاوٹیں ڈالی گئیں۔ یہاں کے مقتدر حلقے، حکمرانوں اور جرنیلوں نے ایک دن کے لیے بھی یہاں اسلام آنے نہیں دیا''۔(7)

20 صفحوں پر مشتمل مضمون میں سے چیدہ چیدہ نکات ہیں جن سے پاکستان میں جنگ کرنے والوں کا نقطہ نظر بالکل واضح ہو کر سامنے آجاتا ہے۔ ان کے خیال میں پوری دنیا کی جہادی تحریکات کا مقصد اقامت دین یا نفاذ شریعت ہے۔

میری یہ مراد نہیں ہے کہ ان حضرات نے سیاسی تعبیر پیش کرنے والے اہل علم کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کر کے یہ موقف اپنایا ہے بلکہ میرا مقصد یہ ہے کہ جب کوئی تعبیر تعلیم یافتہ افراد میں بہت زیادہ مشہور ہو جائے خاص طور پر، اساتذہ، پروفیسر حضرات، صحافی، سیاست دان اور دیگر وہ لوگ جو سماج پر اثر انداز ہوتے ہیں، اس طرح وہ غالب فکر کی حیثیت اختیار کر لے تو اس سے دوسرے اور تیسرے درجے کے روایتی اہل علم کا متاثر ہو جانا کوئی اچھنبے کی بات نہیں ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے آپ جدیدیت، مابعد جدیدیت اور سائنسی منہاج فکر کی مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔ جدیدیت، مابعد جدیدیت اور سائنسی منہاج فکر کے کتنے الفاظ، اصطلاحات اور تصورات ہیں جو غیر محسوس طریقے سے ہمارے دینی فکر کا حصہ بن گئے ہیں۔ ہمارے رویتی اہل علم میں سے کچھ کا خیال ہے کہ، بہت کم اہل علم ہیں جو ان الفاظ، اصطلاحات اور تصورات کو ان کے اصل تناظر میں سمجھتے ہیں۔ ورنہ اکثریت نے غالب فکر کی وجہ سے ان کو اپنایا اور اسلامایا ہوا

ہے۔ اس کی ایک بہترین مثال قرآن مجید کی سائنسی تفسیر اور دین کے تمام احکام کی سائنسی توجیہ کار جحان ہے۔ اسلام کی سیاسی تعبیر کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔

تحریک طالبان، القاعدہ وغیرہ اس سیاسی فکر سے کس حد تک متاثر ہیں اس کا اندازہ لگانے کے لئے ان کے بیانات اور ان کی وہ تحریریں ملاحظہ فرمائیں جو،، نوائے افغان جہاد،، اور،، حطین،، کے شماروں میں شائع ہوتی تھیں۔ ان رسالوں میں دنیا بھر کی احیائی اور اقامت دین کی تحریکات کی خبریں اور ان کے افکار شائع ہوتے ہیں۔ اس کی ایک اور بہترین مثال، مولانا عاصم عمر کی کتاب،، ادیان کی جنگ : دین اسلام یا دین جمہوریت،، اسی طرح شیخ ابو یحی لیبیی کی کتاب،، شمشیر بے نیام،، مولانا محمد زاہد اقبال کی،، عصر حاضر میں غلبہ دین کا نبوی طریقہ کار،، ان سب تحریروں میں آپ کو سیاسی اسلام کا رنگ پورے آب وتاب کے ساتھ نظر آئے گا۔

سلفی مکتب فکر پر بھی اس فکر کے اثرات نظر آتے ہیں، اس کے لیے مولانا عبد الرحمن کیلانی کی تفسیر اور ان کی کتاب،، خلافت وجمہوریت،، ملاحظہ فرمائیں۔ اسی طرح حافظ سعید اور مولانا عبد السلام بھٹوی کی کتابیں بھی اس پر شاہد ہیں۔ عالمی تنظیم،، داعش،، بھی اس کی واضح مثال ہے۔ مکتب دیوبند پر بھی اس کے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ جس کی واضح مثال تحریک طالبان پاکستان اور اس کے حامی لوگ ہیں۔ یاد رہے کہ اہلسنت حنفی دیوبندی مسلک میں اس جدید سیاسی تعبیر اسلام پر تنقید کرنے والوں کی بھی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔ اسی لئے اکثریت نے اس فکر کو مکمل طور پر قبول نہیں کیا۔ یاد رہے کہ جو علماء اس سیاسی تعبیر اسلام پر تنقید کرتے ہیں وہ سب بھی اسلام کو نظام مانتے ہیں اور اسلامی نظام کے قیام کو بہت اہم سمجھتے ہیں مگر وہ اس کو مذہب کا ہدف اصلی، بندہ

مومن کی زندگی کا مشن اور مسلمانوں کی زندگی کا منتہی و مقصود نہیں مانتے اور نہ ہی قرآنی آیات کی ایسی تعبیر اور تشریح کرتے ہیں جس کی مثال چودہ سو سالوں میں نہیں ملتی۔

یہاں تک سنی مذہبی فکر اور جدید سنی اور اقامت نظام والی تحریکات پر سیاسی تعبیر اسلام کا اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ بہت سارے جدید اور معاصر اہل دانش کا خیال ہے کہ اقامت نظام والی تحریکات پر سید مودودی کی سیاسی تعبیر اسلام کا اثر سب سے زیادہ ہے۔

محترم یوسف قرضاوی، محترم خورشید ندیم، محمد مسجد جامعی، ڈاکٹر احمد موصلی، محترمہ بے نظیر بھٹو شہید، مولانا یحییٰ نعمانی، ڈاکٹر احمد محمد جاد سمیت بہت سارے اہل دانش کا یہی نقطہ نظر ہے کہ جدید اور معاصر جہادی، احیائی اور اسلام کی سیاسی بالادستی کے لیے مسلح جدوجہد کرنے والی تمام تحریکات فکری غذا سید مودودی اور سید قطب سے حاصل کرتی ہیں۔ تفصیل ملاحظہ طالب علم کی کتاب،، مذہبی انتہا پسندی ص 295 تا 299 میں ملاحظہ فرمائیں۔

اثنا عشری شیعہ فکر اور سیاسی اسلام

اثنا عشری امامیہ کے ہاں یہ بات متفقہ علیہ سمجھی جاتی تھی کہ دوسرے انسانوں پر حق حکمرانی ائمہ معصومین کا حق ہے۔ معصوم کے علاوہ کسی اور کو مکمل حق ولایت حاصل نہیں۔ امام چونکہ معصوم اور منصوب ہوتا ہے اس لئے اسے یہ حق خدا نے عطا کیا ہے۔ اسی لئے امام معصوم حق ولایت رکھتا ہے۔ ان کے ہاں چونکہ امام کی ایک متعین تعداد ہے اور بارہویں امام کی غیبت کبری کے بعد امامت کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس لئے بارہویں امام کے بعد اہل تشیع کے ہاں وہی مسئلہ پیدا ہوا جو اہل سنت کے مطابق حضور

اکرم کے وصال کے بعد پیدا ہوا۔ یعنی اب حق حکمرانی کسے حاصل ہو گا؟ اہل سنت کے تصور کے مطابق یہ دینی اور دنیاوی دونوں لحاظ سے حکمرانی کا مسئلہ تھا۔ جبکہ اہل تشیع کے ہاں صرف دینی امور میں رہنمائی کے حوالے سے یہ مسئلہ درپیش تھا۔ کیوں کہ حضرت علی کے بعد ویسے بھی کسی امام کو سیاسی حکمرانی کا موقع نہیں ملا۔ ان سے پہلے کچھ عرصے کے لیے امام حسن خلیفہ بنے تھے۔ اس لئے کچھ روایات کی بنیاد پر ان کے ہاں یہ تصور ابھرا کہ اب غیبت امام میں عالم یا فقیہ کی ذمہ داری ہو گی کہ وہ لوگوں کی رہنمائی کریں۔ اس طرح فقہاء کو اپنے علم اور تقویٰ کی بنیاد پر غیر فقہاء پر ولایت حاصل ہے۔ مگر یہ ولایت بھی ولایت فتوی یا کچھ معاملات میں ولایت قضا تک محدود ہے۔ اس سے زیادہ کسی فقیہ کو بھی غیر فقیہ پر کوئی ولایت یا حکمرانی حاصل نہیں۔ اسی کو فقیہ کی ولایت یا ولایت فقیہ کہا جاتا ہے۔ اگرچہ اخباری اور اصولی شیعوں کا اس پر بھی اختلاف ہے۔ بہر حال ولایت فقیہ اسی کو کہا جاتا ہے۔ یہ اہل سنت کے فقہی ائمہ اور مجتہدین مطلق کے تصور کے مشابہ تصور تھا۔ بعد میں جب سنی دنیا میں سیاسی اسلام کا بہت غلغلہ ہوا تو اس تعبیر نے اہل تشیع دنیا کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا اور امام خمینی مرحوم نے بہت شد و مد کے ساتھ ولایت فقیہ کے تصور کو سیاسی مفہوم میں لیکر ولایت فقیہ کا وہ تصور پیش کیا جو آج ایران میں رائج ہے۔ پاکستانی شیعہ دانشور، آیت اللہ سید محمد ہمدانی صاحب اپنے کتابچے ،، ولایت فقیہ افسانہ و حقیقت،، میں ولایت فقیہ کے تصور کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

؛، مسئلہ ولایت فقیہ کے دو پہلو ہیں۔ ایک نظریاتی اور دوسرا عملی۔ جہاں تک نظریاتی پہلو کا تعلق ہے تو اس بات پر شیعہ فقہاء میں ہمیشہ اتفاق پایا گیا ہے کہ فقیہ کو غیر فقیہ پر

ولایت حاصل ہے۔لیکن اس بات میں ہمیشہ اختلاف رہا ہے کہ غیر فقیہ پر فقیہ کی ولایت کی حدود کیا ہیں اور یہ کہ اس ولایت کی رو سے فقیہ کے فرائض و اختیارات کیا ہیں۔اس سلسلے میں تین نظریات پائے جاتے ہیں۔

ایک یہ کہ فقیہ کو غیر فقیر پر فتویٰ کی ولایت حاصل ہے۔اس نظریے کے مطابق ولایت فقیہ یہ ہے کہ غیر فقیہ اپنے دینی معاملات میں فقیہ سے فتویٰ طلب کرے، فقیہ کا فرض ہے کہ وہ فتویٰ دے اور غیر فقیہ کا فرض ہے کہ اس فتویٰ پر عمل کرے۔

دوسری رائے یہ ہے کہ فقیہ کو اختلافات کا فیصلہ کرنے کی ولایت (ولایت قضاء) بھی حاصل ہے۔

تیسری رائے یہ ہے کہ فقیہ کو یہ ولایت حاصل ہے کہ وہ معاشرے میں اسلام کو نافذ کرے۔اس نظریے کے موجد آیت اللہ خمینی تھے۔امام خمینی کے نظریہ ولایت فقیہ کو سادہ الفاظ میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ جامع الشرائط فقیہ کی حاکمیت میں ملکی امور فقہ جعفریہ کے مطابق چلانا۔،،۔ (8)

آیت اللہ نیاز ہمدانی صاحب خود اس نظریے کے ناقدین میں شمار ہوتے ہیں۔

یہ ہے ولایت فقیہ کا مختصر تعارف۔امام خمینی نے اہل تشیع کے ہاں پائی جانے والی ایک اصطلاح کو سیاسی اور انقلابی جامہ پہنایا۔امام خمینی سے پہلے اہل تشیع علماء میں اسلام کی وہ سیاسی تعبیر نظر نہیں آتی جس پر ہم نے تفصیل سے بات کی ہے۔البتہ علامہ علی شریعتی (1933-1977) کے ہاں اس تصور کی ابتدائی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔مگر چونکہ وہ کوئی فقیہ یا آیت اللہ نہیں تھے، بلکہ ایک سماجی مفکر تھے جیسے ہمارے یہاں علامہ اقبال

مرحوم، اس لئے ان کا انداز مختلف ہے۔ البتہ سیاسی اسلام کی چھاپ نظر آتی ہے۔ وہ سرخ شیعت، ابو ذر کا اسلام اور امام حسین کے واقعہ کربلا وغیرہ کو انقلابی اسلام کی نمائندگی کے طور پر پیش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسی دور میں ایران کے ایک اور عالم اور آیت اللہ نعمت اللہ نجف آبادی (1923-2006) کا نام بھی سامنے آتا ہے جنہوں نے امام حسین علیہ السلام کے یزید کے خلاف اقدام کو اسلامی حکومت کے قیام کی جدوجہد قرار دے کر شیعہ علماء میں شدید بے چینی پیدا کردی تھی۔ یہ کتاب پہلی بار 1951 میں شائع ہوئی، اس کتاب پر ہر طرف سے سخت تنقید ہوئی اور ابھی تک تیس سے زیادہ کتابیں اس کی رد میں لکھی جاچکی ہیں۔ شیعت کی تاریخ میں واقعہ کربلا پر اس نہج پر لکھی گئی پہلی کتاب یہی ہے۔ ورنہ اہل تشیع کے ہاں امام حسین کے قیام کے حوالے سے یہ نقطہ نظر نہیں پایا جاتا تھا، نجف آبادی نے اگرچہ شیخ مفید اور سید مرتضیٰ علم الہدی سے بھی اسی موقف کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ آپ کی کتاب کا عنوان شہید جاوید ہے۔ اردو زبان میں میرے ناقص علم کے مطابق اس نہج کی پہلی کتاب متنازعہ اور اہل تشیع کے ہاں بہت ناپسندیدہ، عالم دین علامہ آغا شرف الدین موسوی علی آبادی کی کتاب،، تفسیر سیاسی قیام امام حسین،، ہے۔ ان کے علاوہ عراق کے بعض اہل علم بھی اسلام کی سیاسی تعبیر سے متاثر نظر آتے ہیں اور وہ لوگ کچھ محققین کے خیال میں سید قطب سے متاثر تھے۔ ان میں معروف نام سید باقر الصدر (1935-1980) کا ہے۔ اور حزب الدعوہ تنظیم بھی اسی فکر سے متاثر نظر آتی ہے۔ کچھ اہل علم کے خیال میں یہ اخوان سے بہت زیادہ متاثر تنظیم تھی۔(9)

کیا امام خمینی (1902-1989) مودودی صاحب سے متاثر تھے؟

ان سب لوگوں میں سیاسی اسلام کے سب سے بڑے اور پرزور داعی امام خمینی ہی نظر آتے ہیں۔ امام خمینی خود سید ابوالاعلیٰ مودودی سے متاثر تھے۔ جماعت اسلامی کے اس دور سے آج تک ایران کے مابعد خمینی حکومت کے ساتھ گہرے مراسم اسی وجہ سے ہیں۔ امام خمینی کا سید مودودی کے پیش کردہ سیاسی اسلام سے متاثر ہونا کوئی اچھنبے کی بات نہیں ہے۔ ایک تو پوری دنیا میں سید مودودی کی یہ تعبیر پھیل چکی تھی۔ سید قطب نے اس تصور کو مزید اضافوں کے ساتھ اپنی تحریروں میں پیش کرنا شروع کر دیا تھا۔ پھر خود مودودی صاحب کی کتابوں کے عربی اور فارسی میں ترجمے بھی ہونا شروع ہو چکے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ مسلم دنیا میں اس نئی تعبیر کو جدید اہل علم طبقوں میں بہت زیادہ پزیرائی مل رہی تھی۔ اور ابھی تک یہ سارا کام سنی دنیا میں ہو رہا تھا اور ان کے ہاں بھی یہ ایک نئی تعبیر تھی جس کی بنیاد ہی سید مودودی نے رکھی تھی۔ ان سب وجوہات کے علاوہ کئی ایسے شواہد بھی ہیں جن سے ان دونوں بزرگوں کے گہرے مراسم کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ (10)

قاضی جاوید اپنی کتاب،، اسلام اور مغرب،، میں لکھتے ہیں۔

؛، پاکستان میں چونکہ علمی تجزیے اور افہام و تفہیم کی کوئی باقاعدہ روایت موجود نہیں، اس لئے سید ابوالاعلی مودودی کو ہم لوگ محض جماعت اسلامی کے بانی اور چند مذہبی کتابوں کے مصنف کے طور پر جانتے ہیں، لیکن بیرونی دنیا نے اب عام طور پر مان لیا ہے کہ مسلم دنیا میں بنیاد پرستی کی جو لہریں گزشتہ تین چار عشروں سے چل رہی ہیں، ان کے لئے بنیادی فکری اور تنظیمی کام سید مرحوم نے کیا تھا۔ یہاں تک کہ بہت سے تجزیہ کار امام خمینی پر سید مودودی صاحب کے اثرات ڈھونڈنے لگے ہیں،،۔(11)

مرحوم قاضی صاحب نے امام خمینی کے سید مودودی سے متاثر ہونے کے حوالے سے جس طرف اشارہ کیا ہے اس پر عرب دنیا میں بھی کام ہو رہا ہے اور خود اہل تشیع اہل علم بھی اس کا اقرار کرتے ہیں۔ مثلاً آیت اللہ محمد علی تسخیری (1948) سابق سربراہ ادارہ برائے یکجہتی و قربت مذاہب اسلامیہ، تہران) اپنے مضمون،، ایک فرد جو خود ملت تھا،، میں لکھتے ہیں۔

؛، امام مودودی کی کتاب اسلامی ریاست کو اگر مسلم دنیا میں جدید اور ہمہ گیر بیداری کا سرچشمہ قرار دیا جائے تو ذرہ برابر مبالغہ نہ ہوگا۔۔۔ اس کتاب نے مسلم دنیا میں عوامی بیداری پیدا کی ہے۔ سید مودودی کی اس کتاب سے امام خمینی متاثر ہوئے اور انہوں نے گویا اس کتاب میں اپنا نظریہ ولایت فقیہ شامل کر دیا۔ جس کا خصوصاً ایران اور عراق کے تمام حصوں پر مسلم عوام پر زبردست اثر پڑا۔ یہی وہ کتاب ہے جو ایران میں اسلامی انقلاب کے برپا ہونے کا اہم عامل اور نظریاتی اساس بنی۔ پھر اسلامی مملکت کے قیام اور اس کے دستور کی روح بنی،،۔ (12)

اس مضمون میں محترم تسخیری صاحب نے واضح الفاظ میں تسلیم کیا ہے کہ امام خمینی، سید مودودی سے متاثر تھے۔ اسی مضمون میں تسخیری صاحب نے مودودی کی وفات پر امام خمینی کے تعزیتی خط سے ایک اقتباس بھی پیش کیا ہے۔ اس تعزیت نامے میں امام خمینی، سید ابوالاعلی مودودی کو ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

؛، امت مسلمہ اپنے ایک قابل فخر عالم دین اور مفکر سے محروم ہو گئی۔ علامہ مودودی نے اسلامی مقاصد اور پوری دنیا کے مسلمانوں کی خاطر نمایاں خدمات پیش کیں۔ آپ

صرف پاکستان کے مسلمانوں ہی کے عظیم دینی قائد نہ تھے بلکہ پورے عالم اسلام کے رہنما تھے۔ آپ نے عالم اسلام میں اسلامی انقلابی تحریک کا احیاء کیا جس سے اسلامی انقلاب کا پیغام خطہ ارض تک پھیل گیا۔ اسلامی بیداری کے تمام حامیوں کا فرض ہے کہ وہ ان مقاصد واہداف کو پانے کے لیے لگاتار کام کرتے رہیں۔ آپ کی وفات عالم اسلام کے لیے ایک بہت بڑا نقصان ہے جس کی تلافی ناممکن ہے،،۔(13)

اس کے علاوہ سید علی خامنہ ای کا خلیل احمد حامدی کے نام خط، تذکرہ مودودی ج3، ص 337؛338، پر ملاحظہ فرمائیں(14)

اسی طرح جس وقت امام خمینی اور ان کے ساتھی سیاسی اسلام کا تصور پیش کر رہے تھے اس وقت اہل تشیع کے ہاں اس حوالے سے کوئی کام تھا ہی نہیں جس کی وجہ سے انہوں نے مودودی اور سید قطب کی کتابوں کے ترجمے کروائے۔ سید قطب کی مشہور کتاب،، المستقبل لھذا الدین،، کے ترجمے پر سید خامنہ ای کا مقدمہ بھی بہت اہم ہے۔ (15)

اہل تشیع کی تاریخ میں ولایت فقیہ کے عنوان پر پہلی مفصل کتاب، آیت اللہ منتظری کی،، دراسات في ولاية الفقيه،، ہے۔ خمینی صاحب کی کتاب ولایت الفقیہ یا اسلامی حکومت کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے بلکہ یہ ان کے ان دروس میں سے انتخاب کر کے شائع کیا گیا ہے جو انہوں نے نجف میں دینی علوم کے طلبہ کے سامنے دیئے تھے۔ یہ 1969 (انیس سوانہتر) کی بات ہے۔ اور یہ کتاب پہلی بار 1970 میں بیروت سے شائع ہوئی۔

محمد یسری اپنے مضمون،، مکانۃ سید قطب لدی تیارات الشیعۃ المعاصرۃ وتاثیراتہ علیھا،، میں لکھتے ہیں۔

؛، سید قطب کا مقام صرف سنی تحریکات تک محدود نہیں، بہت سی، معاصر شیعہ تحریکات کے ہاں بھی سید قطب کی بڑی قدر و منزلت ہے۔ شیعی تحریکات کے افکار و نظریات کی تشکیل میں سید صاحب کے نظریات کا بھی بہت عمل دخل ہے،،۔(16)

یہاں تک اختصار کے ساتھ جدید شیعی شیعی فکر پر سید مودودی اور سید قطب کے اثرات کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اب اہل تشیع دنیا اس حوالے سے خود کفیل ہو چکی ہے۔ اس کا اندازہ اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس وقت ایران سے سیاسی اور انقلابی اسلام پر بے تحاشا لٹریچر چھپ رہا ہے۔ اگر یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا تو یہ لٹریچر اپنی وسعت اور تاثیر میں سنی دنیا کے لٹریچر کو کافی پیچھے چھوڑ دے گا۔ یہاں ان سب پر تفصیلی گفتگو کا موقع نہیں۔

ہم جب ان کتابوں کا سرسری جائزہ لیتے ہیں تو یہ بات بہت واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ یہاں بھی طرز استدلال وہی ہے جو سید ابو الاعلی مودودی وغیرہ کا ہے۔ مذہب کی خاص اصطلاحات کی سیاسی تعبیر، توحید اور شرک کی سیاسی تعبیر یہاں تک کہ عبادات وغیرہ کی سیاسی تعبیر سب کچھ آپ کو اسی طرح نظر آئے گا جو سنی دنیا کے سیاسی اسلام میں نظر آتا ہے۔ اسی طرح سیرت رسول کی تعبیر اور مقاصد بعثت انبیاء کی تعبیر میں بھی مکمل مشابہت نظر آتی ہے۔ البتہ اہل تشیع کے ہاں روایات سے اس تعبیر کے استدلال کا انداز الگ ہے۔ اہل سنت کے ہاں تو استدلال کی بنیاد زیادہ تر قرآن مجید پر ہی نظر آتی ہے۔ کیوں کہ احادیث میں اس استدلال کی زیادہ گنجائش نہیں۔ سمع و طاعت اور مسلم حکمرانوں کے حوالے سے موجود احادیث سے سیاسی اسلام پر وہ استدلال نہیں بنتا جس کو

ہم سیاسی اسلام سے تعبیر کرتے ہیں۔ البتہ ٹی ٹی پی اور داعش، حزب التحریر وغیرہ کے ہاں ان احادیث سے بھی استدلال کیا جاتا ہے۔

اسی طرح اہل تشیع کے ہاں ان کچھ آیات سے بھی یہ استدلال نظر نہیں آتا جن سے سنی آزاد خیال مفکرین نے استدلال کیا ہے۔ اس کی واضح وجہ ان آیات کا امام مہدی سے خاص ہونے پر اہل تشیع کا اتفاق نظر آتا ہے۔ البتہ اب کچھ شیعہ اہل علم بھی ان آیات سے استدلال کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان آیات میں آیات اظہار دین، آیت استخلاف، آیت اقامت دین، آیت شہداء علی الناس وغیرہ شامل ہیں۔ یاد رہے کہ متقدمین اہل سنت مفسرین کے ہاں ان آیات کی ایک سے زائد تعبیرات موجود ہیں۔ لیکن ان آیات کی وہ تعبیر یہاں بھی مفقود ہے جو ہمارے سیاسی اور انقلابی اہل علم بیان کرتے ہیں۔

کسی آیت کا کوئی ایسا مفہوم اخذ کرتے ہوئے جو متقدمین کے ہاں نہیں پائی جاتی یہ ضروری ہے کہ ان آیات کا وہ مفہوم بھی پیش کر دیا جائے جو متقدمین کے ہاں بھی مختلف الوجوہ ہے تاکہ قاری کے سامنے ایک سے زائد تعبیرات موجود ہوں اور اسے یہ بات معلوم ہو کہ یہی ایک حتمی اور متفقہ علیہ تعبیر نہیں ہے۔ ہمارے ہاں کی اردو تفاسیر خاص طور پر سیاسی تفاسیر اور جدیدیت سے متاثر اہل علم کی تفاسیر میں یہ نقص نظر آتا ہے۔ سید مودودی نے فقہی آیات اور کلامی آیات میں کافی حد تک اس کا التزام کیا ہے مگر جن آیات سے آپ حکومت الہیہ یا سیاسی مفہوم اخذ کرتے ہیں وہاں آپ یہ التزام نہیں کرتے۔ اسی لئے اردو خواں جدید تعلیم یافتہ طبقہ ان آیات کی اسی ایک تعبیر کو حتمی سمجھتا ہے۔ پاکستان میں تفہیم القرآن کا شمار ان تفاسیر میں ہوتا ہے جو سب سے زیادہ شائع ہوتی

ہے اور تمام سرکاری اور غیر سرکاری لائبریریوں میں رکھی جاتی ہے۔ اسی طرح محسن نجفی کی تفسیر الکوثر میں محترم نجفی صاحب ہر جگہ اس بات کا التزام کرتے ہیں کہ متقدمین سے رشتہ نہ ٹوٹے مگر کچھ مقامات پر جہاں وہ اسلام کی سیاسی تعبیر پیش کرتے ہیں وہاں اس اصول کو ترک کر دیتے ہیں۔ مثلاً سورہ شوریٰ کی آیت نمبر 13، کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔ یہاں،، الدین،، سے کیا مراد ہے اور اقامت دین سے کیا مراد ہے؟ اس پر اہل تفسیر کے ہاں بہت علمی مباحث موجود ہیں۔ اسی آیت سے قدیم مفسرین،، الدین،، اور،، شریعت،، کا فرق بھی بیان کرتے ہیں۔ قرآن مجید کی اہم ترین مقامات میں سے ایک ہے۔ مگر ہمارے انقلابی اور سیاسی مفکرین ان سب کو نظر انداز کر کے اس سے اسلام کو بطور نظام قائم کرنے کا تصور اخذ کرتے ہیں۔ محترم نجفی صاحب نے بھی یہی کیا ہے۔

اہل تشیع کے ہاں اسلام کی سیاسی اور انقلابی تعبیر کے لیے ایک اور اہم استدلال ائمہ معصومین کی کی عملی زندگیاں بھی ہیں۔ اس حوالے سے اہل تشیع کے ہاں ایک اہم تبدیلی ائمہ معصومین کی سیاسی سیرت نگاری کا رجحان بھی ہے۔ انقلاب ایران سے پہلے اور انقلاب کے بعد ناقدین اسلامی حکومت کی کتابوں میں آپ یہ فرق بہت واضح طور پر محسوس کریں گے۔ خاص طور پر واقعہ کربلا ان جدید سیاسی اور انقلابی تعبیر کے حامیوں کے لیے بہت اہم استدلال بن چکا ہے۔ آپ واقعہ کربلا کی سیاسی تعبیر اور روایتی تعبیر میں بھی بہت واضح فرق محسوس کریں گے۔ آیت اللہ نعمت اللہ نجف آبادی، آیت اللہ خمینی، آیت اللہ منتظری، پاکستانی متنازعہ عالم دین آغا شرف الدین موسوی کی کتابیں دیکھ لیجیے اور زمانہ غیبت میں اسلامی حکومت کے عدم قائلین علماء کی کتابوں سے موازنہ کر

لیجیے۔اسی طرح آیت اللہ لطف اللہ صافی کی کتاب،النھضۃ الحسینیۃ وعلم الإمام،، ملاحظہ فرمائیں۔ موصوف سیاسی اسلام اور اسلامی حکومت کے شدت سے قائل ہیں مگر واقعہ کربلا کی سیاسی تعبیر کے شدید ناقد ہیں۔اس حوالے سے عبدالکریم آل نجف کی کتابیں خاص طور پر،، نظریۃ الثورۃ والمقاومۃ،، شیخ قیصر تمیمی کی،، الأھداف والمبادئ السیاسیۃ لنھضۃ الإمام الحسین،، آیت اللہ کاظم حائری کی،، الکفاح المسلح،، شیخ محمد مہدی آصفی کی کتاب،، فقہ المقاومۃ،، ڈاکٹر حکمت رحمت کی،، الأطر الشرعیۃ والقانونیۃ لثورۃ الإمام الحسین،، وغیرہ ملاحظہ فرمائیں۔اس کے علاوہ بیشمار کتابیں اس موضوع پر لکھی گئی ہیں اور مسلسل لکھی جارہی ہیں۔

ائمہ معصومین کی سیاسی سوانح نگاری پر بھی اب کافی کام ہورہاہے۔ باقرالصدر کی کتاب،، أھل البیت تنوع أدوار ووحدۃ ھدف،، دیکھ لیں۔اسی طرح خامنہ ای کی کتاب جس کا اردو ترجمہ،، ڈھائی سو سالہ انسان،، کے عنوان سے ہوا ہے۔اس کتاب کا اصل زور ہی اسی پر ہے کہ حضور اکرم سے بارہویں امام تک اہلبیت کے تمام اہم افراد اور خاص طور پر ائمہ معصومین کی زندگیوں کا مقصد سیاسی جدوجہد سے عبارت ہے اور ان سب کا مقصد حکومت الہیہ کا قیام تھا،اسی لئے سارے حکمرانوں سے ان کی جنگ رہی۔ائمہ معصومین کے پیروکاروں کے لیے ان کی سیرت کا یہ پہلو بھی مشعل راہ اور قابل استدلال ہے۔خامنہ ای صاحب کا خیال ہے کہ ان ائمہ کی زندگی کا اس انداز سے مطالعہ بہت اہم ہے۔کتاب کے مقدمے میں لکھتے ہیں۔

؛،اس حقیقت کے پیش نظر کہ اہل بیت رسول یعنی ائمہ معصومین کی پوری زندگی سیاسی جدوجہد سے عبارت ہے،اس قابل ہے کہ اس کو ایک مستقل عنوان کے تحت زیر بحث لایا جائے۔ میں یہاں اس موضوع کو قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کرنا چاہتا ہوں۔

،،پہلی چیز سیاسی جدوجہد یا جانکاہ سیاسی جدوجہد جسے ہم ائمہ معصومین کی جانب نسبت دیتے ہیں اس سے ہماری مراد کیا ہے؟،،۔(17)

اس کے بعد خامنہ ای صاحب بتاتے ہیں کہ ان ائمہ کی زندگیوں کا مقصد صرف دعوت و تبلیغ اور درس وتدریس نہیں تھا،ان حضرات کی درس وتدریس کا مقصد محض اپنے مکتب کی حقانیت ثابت کرنا نہیں تھا بلکہ ان کے مقاصد اس سے کہیں بلند تھے۔نہ ہی ان حضرات نے کوئی مسلح جدوجہد کی، البتہ مسلح جدوجہد کرنے والوں کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کی۔اس کے بعد لکھتے ہیں۔

؛،ائمہ معصومین علیہم السلام کی سیاسی جدوجہد سے مراد نہ تو مذکورہ علمی مقابلہ ہے اور نہ ہی دوسری نوعیت کا مسلحانہ قیام، بلکہ اس سے مراد سیاسی مقصد کے تحت جدوجہد ہے اور وہ سیاسی مقصد،، حکومت اسلامی کا قیام،، ہے جس کو ہم اپنی زبان میں،، حکومت علوی،،سے تعبیر کر سکتے ہیں،،۔

آگے چل کر خامنہ ای صاحب ان لوگوں پر شدید تنقید کرتے ہیں جو سیاسی اسلام کے قائل نہیں۔یا جو لوگ اسلام اور سیاست کو جدا سمجھتے ہیں۔ حضور اکرم کی زندگی کے مختلف مراحل اور آپ کے کچھ اقدامات کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

؛، یہ سب کچھ سیاست ہے۔ کس طرح اسلام کو سیاست سے جدا کیا جاسکتا ہے؟ سیاست کو کس طرح اسلام کی ہدایت کے بغیر کسی اور کی ہدایت میں سمجھا اور اجرا کیا جاسکتا ہے؟ الَّذِيْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِيْنَ ﴿۹۱﴾، (سورہ حجر) جنہوں نے قرآن کے ٹکڑے ٹکڑے کئے) بعض لوگ قرآن کو جدا جدا کر دیتے ہیں۔ (یؤمن ببعض الکتاب ویکفر ببعض)تحف العقول)اس کی عبادت پر ایمان لاتے ہیں لیکن اس کی سیاست پر نہیں لاتے، (لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ) یہ قسط کیا ہے؟ قسط یعنی معاشرے میں اجتماعی عدالت کا قیام۔ یہ کام کون انجام دے سکتا ہے؟ معاشرے کی تشکیل، عدالت اور قسط، یہ ایک سیاسی کام ہے۔ جن کے ہاتھوں میں ملک کی عنان ہو وہ ہی یہ کام انجام دے سکتے ہیں۔ یہ ہے انبیاء کا ہدف۔ صرف ہمارے پیغمبر نہیں بلکہ حضرت عیسی، حضرت موسی، حضرت ابراہیم اور باقی تمام انبیاء سیاست اور اسلامی نظام کے قیام کے لئے مبعوث ہوئے تھے،،۔ ص20؛ 21

بہر حال ائمہ معصومین کی سیرت و کردار کی سیاسی تعبیر کے لئے یہ ایک اہم کتاب ہے۔ اسی طرح محمد جواد مغنیہ کی کتاب،،الشیعۃ والحاکمون،، بھی اس کی ایک مثال ہے۔

سیاسی اسلام کے دینی استدلال

اسلام کی سیاسی تعبیر پیش کرنے والے اہل علم اور مفکرین نے مندرجہ ذیل دلائل کو بنیاد بنا کر یہ تعبیر پیش کی ہے۔

آیات اظہار دین، آیت استخلاف، سورہ نور آیت نمبر 55، آیت تمکین، سورہ حج آیت نمبر 41، آیت اقامت دین، سورہ شوری آیت نمبر 13، آیت شہداء علی الناس، سورہ بقرہ آیت نمبر 143، سورہ حج آیت نمبر 78، بعثت انبیاء کے مقاصد والی آیات خاص طور پر الحدید کی آیت نمبر 25، عدل وانصاف والی آیات، مائدہ کی آیات 44؛ 45؛ 47، امر بالمعروف والی آیات۔ اسی طرح توحید، توحید حاکمیت کا تصور، شرک، الہ، رب، عبادت، حکم، دین، دین حق، جاہلیہ، طاغوت وغیرہ الفاظ۔ جہاد اور قتال کی تعبیر بطور سیاسی اور انقلابی تبدیلی کا ذریعہ۔، خاص طور پر وہ آیات جن میں،، فتنہ،، کے خاتمے تک جنگ کا حکم ہے۔ البقرہ، 193؛ 217؛ انفال آیت نمبر 39۔ اسلام میں علت قتال پر اہل علم اور فقہاء عظام کا ہمیشہ اختلاف رہا ہے، اسی طرح اقسام جہاد کی تفصیلات میں بھی علماء کا اختلاف رہا ہے، مگر یہ ساری بحثیں اسلام بطور مذہب اور جہاد بطور ایک مذہبی فریضے کے طور پر رہی ہیں۔ قتل مرتد کی سیاسی تعبیر وغیرہ۔

یہاں ان تمام موضوعات پر تفصیلی گفتگو اور ان ساری استدلالی آیات کے تقابلی مطالعہ اور جہاد وقتال کی قدیم اور جدید تعبیر میں فرق وغیرہ پر تقابلی گفتگو کی گنجائش نہیں اس لئے بطور نمونہ ایک آیت کی تقابلی تفسیر پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ اگر آپ جہاد وقتال پر تفصیلی مباحث دیکھنا چاہتے ہیں تو ڈاکٹر مشتاق کی کتاب،، جہاد، مزاحمت اور بغاوت، محترم عمار خان ناصر کی کتاب،، جہاد ایک مطالعہ، ماہنامہ الشریعۃ گجرانوالہ کا خصوصی شمارہ،، جہاد۔ کلاسیکی وعصری تناظر میں،، اور مذہبی انتہاپسندی کا جوابی بیانیہ،، ملاحظہ فرمائیں۔

سورہ توبہ آیت نمبر 33۔ یہی آیت الفاظ کی تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ، سورہ فتح آیت نمبر 28 اور سورہ صف آیت نمبر 9 میں بھی آئی ہے۔ پہلے تینوں آیات ملاحظہ فرمائیں۔

سورہ توبہ

هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ ۙ وَلَوۡ کَرِهَ الۡمُشۡرِکُوۡنَ (33)

سورہ فتح

هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ ؕ وَکَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیۡدًا(28)

سورہ صف

هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ ۙ وَلَوۡ کَرِهَ الۡمُشۡرِکُوۡنَ (9)

مولانا اشرف علی تھانوی: (چنانچہ) وہ اللہ ایسا ہے کہ اس نے اپنے رسولؐ کو ہدایت (کا سامان یعنی قرآن) اور سچا دین دے کر بھیجا ہے تاکہ اس کو تمام (بقیہ) دینوں پر غالب کر دے، گو مشرک کیسے ہی ناخوش ہوں۔

محسن علی نجفی: اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ اسی نے بھیجا ہے تاکہ اسے ہر دین پر غالب کر دے اگرچہ مشرکین کو برا ہی لگے۔

مولانا مودودی، ڈاکٹر اسرار احمد اور غلام احمد پرویز تینوں کے نزدیک ان آیات میں اسلام کو بطور نظام غالب کرنے اور دیگر نظامہائے زندگی کو مغلوب کرنا رسول کا مشن بتایا گیا ہے۔ یہ مشن رسول کے بعد امت کا بھی ہے۔ اب امت کی ذمہ داری ہے کہ وہ دیگر

مذاہب اور عقائد کو برداشت کرے لیکن کسی نظام کو برداشت نہ کرے۔ ہر غیر اسلامی نظام زندگی پر اسلام کو بطور نظام غالب کر کے دنیا میں حکومت واقتدار کا مالک بن جائے

سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم سورہ توبہ آیت نمبر 33 کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔،

,, متن میں ''الدین'' کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کا ترجمہ ہم نے ''جنس دین'' کیا ہے۔ دین کا لفظ، جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں، عربی زبان میں اس نظام زندگی یا طریق زندگی کے لیے استعمال ہوتا ہے جس کے قائم کرنے والے کو سند اور مطاع تسلیم کر کے اس کا اتباع کیا جائے۔ پس بعثت رسول کی غرض اس آیت میں یہ بتائی گئی ہے کہ جس ہدایت اور دین حق کو وہ خدا کیطرف سے لایا ہے اسے دین کی نوعیت رکھنے والے تمام طریقوں اور نظاموں پر غالب کر دے۔ دوسرے الفاظ میں رسول کی بعثت کبھی اس غرض کے لیے نہیں ہوئی کہ جو نظام زندگی لے کر وہ آیا ہے وہ کسی دوسرے نظام زندگی کا تابع اور اس سے مغلوب بن کر اور اس کی دی ہوئی رعایتوں اور گنجائشوں میں سمٹ کر رہے۔ بلکہ وہ بادشاہ ارض و سما کا نمائندہ بن کر آیا ہے اور اپنے بادشاہ کے نظام حق کو غالب دیکھنا چاہتا ہے۔ اگر کوئی دوسرا نظام زندگی دنیا میں رہے بھی تو اسے خدائی نظام کی بخشی ہوئی گنجائشوں میں سمٹ کر رہنا چاہیے جیسا کہ جزیہ ادا کرنے کی صورت میں ذمیوں کا نظام زندگی رہتا ہے۔ (ملاحظہ ہو الزمر، حاشیہ 3، المومن، حاشیہ 43۔ الشوریٰ حاشیہ 20)؛،۔(18)

مولانا مودودی نے سورۃ الفتح کی آیت نمبر 28 کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہم،، دین،، کی مفصل تشریح سورہ زمر آیت نمبر 2، حاشیہ نمبر 3 اور سورہ شوری آیت نمبر

13، حاشیہ نمبر 20 میں کر چکے ہیں اور پھر آخر میں لکھتے ہیں کہ محمد ص کی بعثت کا مقصد محض اس دین کی تبلیغ نہ تھا بلکہ اسے دین کی نوعیت رکھنے والے تمام نظامات زندگی پر غالب کر دینا تھا۔ پھر اس کی مزید تفصیل کے لیے سورۃ الزمر کی آیت نمبر 29 حاشیہ نمبر 48 کی طرف رجوع کرنے کا کہا ہے۔ سورۃ الزمر آیت نمبر 29 کی تفسیر میں مولانا نے بہت طویل حاشیہ لکھا ہے، وہ سب یہاں نقل کرنا تو ممکن نہیں ہے البتہ اس آیت کا ترجمہ اور مودودی صاحب کی تشریح کے چیدہ چیدہ نکات پیش خدمت ہیں:

ترجمہ: آیت نمبر 29 سورۃ الزمر: از فتح محمد جالندھری ''خدا ایک مثال بیان فرماتا ہے کہ ایک شخص ہے جس میں کئی (آدمی) شریک ہیں۔ (مختلف المزاج اور) بدخو اور ایک آدمی خاص ایک شخص کا (غلام) ہے بھلا دونوں کی حالت برابر ہے؟ (نہیں) الحمد اللہ۔ بلکہ اکثر لوگ نہیں جانتے''۔

اس آیت مبارکہ میں شرک اور توحید کو ایک مثال کے ذریعہ واضح کیا گیا ہے، لیکن مولانا مودودی اس سے توحید کے سیاسی حاکمیت کا معنی اخذ کرتے ہیں جو کچھ آپ نے لکھا وہ نکات کی صورت میں پیش خدمت ہیں:

۱۔ اس آیت میں اللہ نے شرک اور توحید کے فرق اور انسان کی زندگی پر اس کے اثرات کو بیان کیا ہے۔

۲۔ بہت سے کج خلق اور باہم متنازع آقاؤں کی تمثیل پتھر کے بتوں پر درست نہیں آتی۔

۳۔ توحید کا مسلک اختیار کر کے انسان اس تنگی سے نکل سکتا ہے۔

۴۔ توحید کی دو شکلیں ہیں (۱) انفرادی حیثیت سے خدا کا بندہ بننا (۲) اجتماعی حیثیت میں توحید اختیار کرنا۔

۵۔ اجتماعی شکل میں توحید کو ماننے کا مطلب خدا کی سیاسی حاکمیت کا ماننا ہے۔

۶۔ اسلام کا مقصود دوسری صورت پیدا کرنا ہے۔

۷۔ تمام انبیاء کی کوششوں کا مدعا یہی ہے۔

۸۔ جو شخص قرآن و سنت سے بے بہرہ ہوگا وہ اس کو انبیاء کی سعی و جہد کا مقصود نہیں مانے گا۔

۹۔ ایسا شخص یہ بھی نہیں مانے گا کہ انبیاء کا مقصد دین کو نافذ اور قائم کرنا تھا۔)
19)

اب ان نکات اور سابقہ تین آیات کی تشریح کو سامنے رکھنے سے انبیاء کا اور حضور اکرمؐ کا مشن یہ نظر آتا ہے کہ خدا کی سیاسی حاکمیت قائم کی جائے، دیگر تمام نظاموں کو یا تو بالکل ختم کیا جائے یا پھر اسلام کے ماتحت لایا جائے۔ جب انبیاء کا اور حضور اکرمؐ کا مشن اور ان کی سعی اور جد وجہد کا منتہٰی و مقصود یہی ہے تو اس سے ثابت ہوا کہ ان انبیاء کے ماننے کے دعویدار بھی اپنا مشن اور مقصد اسی کو بنائیں یعنی حکومت الٰہیہ کا قیام لہذا حکومت الٰہیہ کا قیام نہ صرف واجب اور فرض ہے بلکہ دین، انبیاء کرام اور مومن کی زندگی کا مقصد اور نصب العین بھی ہے۔ مولانا مودودی مرحوم ایک جگہ اسلامی نصب العین کے عنوان پر سورۃ التوبہ کی یہی آیت نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''دراصل'' دین کا لفظ قریب قریب وہی معنی رکھتا ہے جو زمانۂ حال میں ''اسٹیٹ'' کے معنی ہیں۔ لوگوں کا کسی بالاتر اقتدار کو تسلیم کرکے اس کی اطاعت کرنا۔ یہ

''اسٹیٹ'' ہے۔ یہی دین کا مفہوم بھی ہے..... پس در حقیقت اللہ کا رسولؐ اپنے بھیجنے والے کی طرف سے ایک ایسے ''اسٹیٹ'' کا نظام لے کر آیا ہے جس میں نہ تو انسان کی خود اختیاری کے لیے کوئی جگہ ہے نہ انسان پر انسان کی حاکمیت کے لیے کوئی مقام بلکہ حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ جو کچھ بھی ہے صرف اللہ کے لیے ہے..... پھر رسول کے بھیجنے کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ وہ اس نظام اطاعت (دین) اور قانون حیات (الہدیٰ) کو پوری جنسِ دین پر غالب کر دے..... یہ رسول کا مشن ہے اور رسول اس مشن کو پورا کرنے پر مامور ہے خواہ شرک کرنے والے اس پر کتنی ہی ناک بھوں چڑھائیں۔ شرک کرنے والے کون ہیں؟ وہ سب لوگ جو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اللہ کی اطاعت کے ساتھ دوسری مستقل بالذات (یعنی خدا کی اطاعت سے آزاد) اطاعتیں شریک کرتے ہیں..... اور جو لوگ شرک کی ان مختلف صورتوں میں مبتلا ہیں۔ ان کو یہ بات ناگوار ہوتی ہے کہ اپنی فطری اطاعت کی طرح اپنی اختیاری اطاعت و بندگی کو بھی بالکلیہ اللہ کے لیے خالص کریں..... یہ ہے اسلامی نصب العین اور اس نصب العین کی طرف پیشقدمی کرنے کے لیے راہ راست وہی ہے جو اللہ کے رسولؐ نے اختیار کی..... (اس کا) تیسرا جزو یہ ہے کہ براہ راست غیر الٰہی نظام اطاعت پر حملہ کیا جائے، تمام کوششوں کا مقصود صرف اس ایک بات کو بنایا جائے کہ اللہ کی حاکمیت قائم ہو اور اس کے سوا کسی دوسری چیز کو مقصود بنا کر اس کے پیچھے قوتیں ضائع نہ کی جائیں''۔ (20)

اسی مضمون میں دو جگہ حاشیہ میں مولانا مرحوم نے ان لوگوں کے نظریئے پر تنقید کی ہے جو نبیؐ کے مقصد بعثت میں، حکومت کے قیام کو نہیں مانتے۔ ان تمام مقامات پر کہیں بھی مودودی صاحب متقدمین کا کوئی حوالہ نہیں دیتے۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی رائے: محترم ڈاکٹر صاحب نے اس آیت پر کافی تفصیلی بحث کی ہے آپ نے اپنی بحث کی بنیاد سورۃ الصف کی آیت کو بنایا ہے اور اس پر عنوان باندھا ہے۔ ''جہاد و قتال فی سبیل اللہ کی غایت قصوی اظہار دین حق'' اس بحث میں آپ کے خیالات کے چند نکات پیش خدمت ہیں:

''اسی طرح یہ بات بھی جان لیجئے کہ دین کی اقامت اور اس کا غلبہ نبی اکرمؐ کی بعثت کے بنیادی مقاصد میں سے ہے۔ یہ بات پوری وضاحت کے ساتھ سورہ الصف کی مرکزی آیت کے حوالے سے ہمارے سامنے آئے گی۔ هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُولَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّه،، اس ضمن میں اگر کسی کو اشتباہ ہے اور نیک نیتی کے ساتھ اشتباہ ہے تو وہ اللہ کے ہاں تو عذر پیش کر سکے گا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ پھر قرآن مجید اور اس کے فہم سے اسے کوئی حصہ حاصل نہیں! دین کو دنیا میں ایک عملی اور ایک زندہ نظام کی حیثیت سے قائم اور برپا کرنا بعثت محمدیؐ کا بنیادی مقصد ہے۔ اسی کے لیے محنت اسی کے لیے جدوجہد، اسی کے لیے کوشش، اسی کے لیے جینا، اسی کے لیے مرنا، اسی میں مال اور جان کھپانا بندہ مومن کے ایمان کا لازمی تقاضا ہے''۔ (21)

اسلام کو بطور نظام غالب کرنے والوں کی آراء کا خلاصہ :

۱- یہاں دین سے مراد نظام زندگی، ضابطہ حیات یا مذہب بمعنٰی سیاسی نظام ہے۔

۲- مودودی اور ڈاکٹر صاحب کے نزدیک ''الدین'' کا مطلب جنس دین ہے یعنی دین کی نوعیت رکھنے والے تمام طریقے اور نظام ہائے زندگی۔

۳- پرویز صاحب کے نزدیک ''الدین'' سے تمام نظام ہائے زندگی مراد ہیں۔

۴- یہ آیت بعثتِ نبویؐ کا مقصد یہ بتاتی ہے کہ اسلامی نظام کو دنیا کے تمام نظاموں پر غالب کیا جائے۔

۵- اس آیت میں، تمام دنیا کے نظاموں پر غلبہ مقصود ہے۔

۶- یہی مقصد بعثت تمام انبیائے کرام کا بھی تھا۔

۷- جو لوگ اس آیت کو اس مفہوم میں نہیں لیتے وہ قرآن و سنت سے بے بہرہ ہیں (مودودی) یا ایسے لوگوں کو قرآن مجید اور اس کے فہم سے کوئی حصہ حاصل نہیں (اسرار) یا پھر ایسے لوگ غلط فہمیوں اور گمراہیوں کو پیدا کرتے ہیں (پرویز)۔

۸- جب حضور اکرمؐ کا مشن یہ تھا تو پوری امت پر اس مشن کو ادا کرنا اور اس کے لیے ہر طرح کی قربانیاں دینا فرض ہے۔

آیت اظہار دین: متقدمین کے نزدیک:

۱-ابو جعفر محمد بن جریر طبری (224-310ھ): مسلم تاریخ کی پہلی مفصل تفسیر، المعروف ''تفسیر طبری'' میں سورۃ التوبہ کی مذکورہ آیت کی تشریح میں امام طبری لکھتے ہیں :

"لِيُظْهِرَه' عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهِ" کے تفسیر میں اہل علم کا اختلاف ہے۔ کچھ کے نزدیک یہ خروجِ عیسیٰؑ کے وقت میں ہوگا جب تمام مذاہب ایک ہو جائیں گے، یہ رائے حضرت ابوہریرہؓ کی ہے، آپؓ نے فرمایا کہ: اس وقت ہوگا جب حضرت عیسیٰؑ تشریف لائیں گے..... جبکہ کچھ اہل علم کا خیال ہے کہ اسکا

مطلب ہے اللہ اپنے نبیؐ کو تمام ادیان کی شریعتیں سکھادے گا۔ اور آپؐ کو ان تمام شرائع کا علم حاصل ہو جائے گا یہ رائے حضرت عبداللہ بن عباس کی ہے، آپ نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ تاکہ ظاہر کردے اللہ اپنے نبی کو دین کے تمام معاملات پر، آپ کو دین کے بارے میں سب کچھ بتادیا جائے اور کچھ بھی مخفی نہ رہے، مشرکین اور یہود کو یہ بات گراں گزرتی تھی"۔ (22)

سورۃ الفتح کی آیت نمبر 28 کی تفسیر میں لکھتے ہیں: تاکہ وہ باطل کردے، اس دین کے ذریعہ تمام مذاہب کو یہاں تک کہ صرف اسلام باقی رہے اور یہ اس وقت ہوگا جب حضرت عیسیٰؑ نازل ہونگے وہ دجال کا قتل کریں گے اور اس وقت تمام ادیان باطل ثابت ہونگے اس دین کے علاوہ جو حضرت محمدؐ کو دے کے بھیجا گیا ہے اور اسلام تمام ادیان پر غالب آئے گا(23) "

سورۃ الصف کی آیت نمبر 9 کی تفسیر میں انہی نکات کو دہرایا ہے اور حضرت عائشہؓ کی ایک حدیث بھی پیش کی"۔(24)

۲ -احمد بن ابو بکر قرطبیؒ (671ھ): مشہور مفسر قرآن امام قرطبیؒ نے سورۃ التوبہ کی آیت مذکورہ کی تفسیر میں سابقہ آراء کے ساتھ مزید ان آراء کا بھی ذکر کیا ہے، قرطبیؒ لکھتے ہیں:

"جبکہ سدی کے نزدیک امام مہدیؑ کے خروج کے وقت یہ ہوگا اس وقت یا تو سب لوگ مذہب اسلام میں داخل ہو جائیں گے یا پھر جزیہ ادا کریں گے..... جبکہ ایک رائے یہ بھی ہے کہ اس سے مراد جزیرہ عرب کے تمام ادیان پر غلبہ مراد ہے اور یہ کام ہو چکا"۔ (25)

سورۃ الفتح کی آیت نمبر 28 کی تفسیر میں قرطبیؒ لکھتے ہیں:

"یعنی اس دین کو تمام ادیان پر غالب کرنا مراد ہے، دین اسم بمعنٰی مصدر ہے۔ اس میں واحد اور جمع برابر ہوتے ہیں، یہ بھی اس کی تفسیر میں کہا گیا ہے کہ تاکہ وہ اپنے رسولؐ کو تمام ادیان پر غالب کر دے یعنی ادیان کی شریعتوں پر، دلیل کے ذریعے پھر ہاتھ اور تلوار کے ذریعے اس کے علاوہ صورتیں منسوخ ہیں (26)."

اور سورۃ الصف کی آیت نمبر 9 کی تفسیر میں لکھتے ہیں :

"تاکہ اس کو غالب کر دے، کا مطلب ہے دلائل کے ذریعے غالب کرنا اور غلبہ سے مراد قتال کے ذریعے بھی ہو سکتا ہے اور غالب کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کوئی دوسرا مذہب نہ رہے بلکہ اس کا مطلب اہل ایمان کا باقیوں پر غالب آنا اور غلبہ کی صورت یہ بھی ہے کہ اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا مذہب نہ رہے، یہ آخری زمانہ میں ہوگا۔ مجاہد کہتے

ہیں نزول عیسیٰؑ کے وقت ہوگا جب زمین پر اسلام کے علاوہ کوئی اور مذہب نہیں رہے گا''۔(27)

۳۔ علاؤالدین علی بن محمد بن ابراہیم الخازن (وفات 725ھ): معروف مفسر قرآن امام خازن نے اپنی تفسیر میں سورۃ التوبہ کی مذکورہ آیت کی تشریح میں سابقہ آراء کے ساتھ مزید آراء کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تاکہ اس کو غالب کردے تمام ادیان پر حضرت عبداللہ بن عباس کے نزدیک (لِیُظْهِرَہٗ') میں ہ' کی ضمیر کا مرجع رسول ﷺ ہے اور اس کا مطلب ہے تاکہ وہ خدا اس نبی کو تمام مذاہب کی شریعتوں پر دسترس عطا کرے، یہاں تک کہ آپ ﷺ پر کوئی چیز مخفی نہ رہے، جبکہ دیگر مفسرین کا خیال ہے کہ یہاں پر ضمیر ہ' کا مرجع دین حق ہے۔ اس صورت میں اس کا مفہوم ہوگا تاکہ وہ دین اسلام کو تمام ادیان پر غالب کرے اور اس کی صورت یہ ہوگی کہ عبادت صرف خدائے واحد کی، کی جائے گی۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں بے شک اللہ نے اپنے رسول کے دین کو تمام ادیان پر غالب کردیا ہے وہ اس طرح کہ اس نے اس دین کو اتنا واضح کرکے بیان کیا ہے جو بھی اس کو سنے گا وہ اس کو حق جانے گا اور اس کے مقابلے پر تمام ادیان باطل نظر آئیں گے، اور اللہ نے اس دین کو شرک اور اہل کتاب اور مکہ والوں کے دین پر غلبہ عطا فرمایا۔ اللہ کے رسول ﷺ اہل مکہ پر غالب آئے یہاں تک کہ انہوں نے خوشی سے یا ناخوشی سے اس دین کو تسلیم کرلیا اور اہل کتاب کو قتل اور قیدی بنایا، یہاں تک کہ کچھ لوگ مسلمان ہوگئے اور کچھ لوگ جزیہ دینے پر مجبور ہوئے تو یہ ہے اسلام کے تمام دینوں پر غالب آنے کا مطلب''۔(28)

امام خازن سورۃ الفتح کی آیت نمبر 28 کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ :

"جب اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو خواب میں دکھایا کہ آپ ﷺ مسجد حرام میں داخل ہو رہے ہیں تو اس آیت میں اسی کا ذکر ہے کہ اب مکہ فتح ہو جائے گا اور خدا اس دین کو تمام ادیان پر غلبہ عطا فرمائے گا"۔(29)

سورۃ الصف کی آیت کے ضمن میں بھی اس غلبہ کو اس زمانے کے ادیان پر غلبہ مراد لیا ہے۔ لکھتے ہیں

"تاکہ وہ اس دین کو ان تمام ادیان پر غالب کر دے جو اس دین کی مخالفت میں کھڑے تھے اور یہ بالفعل ہو چکا، تمام ادیان اسلام کے مقابلے پر مغلوب ہو گئے"۔(30)

۴ -ماوردی بصری (364-450ھ) کی رائے: ابوالحسن علی بن محمد بن حبیبا ماوردی بصری اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"تاکہ اس کو غالب کر دے تمام ادیان پر اس کے بارے میں چھ رائے ہیں:

۱- یہ نزول عیسیٰ علیہ السلام کے وقت میں ہو گا جب اسلام کے علاوہ کوئی اور دین نہیں رہے گا۔ یہ ابو ہریرہؓ کی رائے ہے۔

۲- یہ کہ اللہ اپنے نبیؐ کو تمام شریعتوں کا علم عطا کرے گا۔ یہ ابن عباسؓ کی رائے ہے۔

۳- اللہ اس دین کے دلائل اور براہین کو غلبہ عطا فرمائے گا اور اللہ نے یہ کام کر دکھایا ہے یہ اکثر علماء کی رائے ہے۔

۴۔ مشرکین کی خواہشات کے علی الرغم اس کو غلبہ عطا کرے گا۔

۵۔ اس آیت کا ایک شان نزول ہے وہ یہ کہ قریش دو مرتبہ سفر کیا کرتے تھے، گرمیوں میں شام کی طرف اور سردیوں میں یمن اور عراق کی طرف جب یہ قریش والے مسلمان ہو گئے تو ان کے یہ سفر ختم ہو گئے کیونکہ ان کا دین اب ان لوگوں سے الگ ہو گیا تھا تو لوگوں نے حضور اکرمؐ سے اس کی شکایت کی۔ جس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی اور ان کو بتایا گیا کہ ان دو ملکوں میں اللہ دین کو غلبہ عطا کرے گا۔

۶۔ یہاں ظہور سے مراد بالادستی ہے یعنی دین اسلام تمام ادیان یا اکثر ادیان پر اپنے ماننے والوں کی حیثیت سے بالادست رہے گا"۔(31)

ماوردی مرحوم نے سورۃ الفتح کی آیت پر کوئی تشریح نوٹ نہیں لکھا ہے۔ البتہ سورۃ الصف کی آیت کی تشریح میں لکھتے ہیں:

"یہاں غلبہ سے کیا مراد ہے؟ اس پر تین اقوال ہیں (۱) تمام مذاہب والوں پر غلبہ (۲) تمام مذاہب پر بالادستی اور (۳) تمام ادیان کے بارے میں علم کا حاصل ہو جانا یعنی ان مذاہب کی کوئی چیز پوشیدہ نہیں رہے گی"۔(32)

یہاں پر آپ کے سامنے اہلسنت کے معتبر مفسرین کی آراء پیش کی گئی ہیں اب آپ خود فیصلہ فرمایئے کہ کیا ان میں سے کسی نے بھی ان تینوں آیتوں سے وہ مفہوم اخذ کیا ہے جو ہمارے دور کے مذہب کی سیاسی تعبیر پیش کرنے والوں نے کیا ہے؟ ان تمام مفسرین نے اہل علم کے اختلاف کا ذکر کیا ہے۔ لیکن ہمارے یہ مفکرین بغیر یہ بتائے کہ سابقہ

اہل علم نے ان آیات کا کیا مفہوم لیا ہے، اپنی رائے بلا جھجھک پیش کرتے ہیں اور اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ گویا یہی متفق علیہ مفہوم ہے، حالانکہ دیانتداری کا تقاضا تو یہ ہے کہ اگر آپ اپنے پیش روؤں سے اختلاف رکھتے ہیں تو ان کی آراء بھی پیش کریں اور پھر ان پر تنقید کر کے دلائل کے ساتھ ان کی رائے کی غلطی واضح کریں اور پھر اپنی رائے دیں، اب ان حضرات کی اس تعبیر نے جو پوری امت کی تاریخ میں کہیں اور نہیں ملتی، ایک ایسے کام کو جس کا امت کے فرائض سے قطعاً کوئی تعلق نہیں تھا پہلے تو پوری امت پر فرض قرار دیا اور پھر اسی پر بس نہیں کیا بلکہ اس کو امت کا مقصد اور نصب العین قرار دیا اور نصب العین بھی یہ نہیں کہ اسلام کی حقانیت دلیل اور برہان کے ذریعے باقی مذاہب پر ثابت کیا جائے بلکہ یہ کہ اسلام کو بطور نظام کے باقی تمام نظاموں پر غالب کیا جائے تا آنکہ کوئی دوسرا نظام یا تو رہے نہ یا پھر اسلام کے ماتحت رہے اور سب سے دلچسپ پہلو یہ کہ ان حضرات کے نزدیک جو لوگ اس آیت سے ان کا متعین کردہ مفہوم نہیں لیتے وہ قرآن و سنت سے بے بہرہ، فہم قرآن سے عاری اور غلطی اور گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔

جدید مفسرین کی آراء :

اب چند جدید اہلسنت مفسرین کی آراء بھی ملاحظہ فرمائیں جس سے فیصلہ کرنے میں ہمارے لیے آسانی ہو گی کہ ان مذہبی سیاسی مفکرین کی تعبیر باقی اہل علم سے کس قدر مختلف ہے۔

علامہ غلام رسول سعیدی: آپ اہلسنت بریلوی مسلک کے مستند صاحب علم بزرگ ہیں۔ علامہ صاحب نے اپنی تفسیر ''تبیان القرآن میں اس سے دلائل اور حجت کے اعتبار سے غلبہ مراد لیا ہے اور اگر مادی غلبہ مراد لیا جائے تو ان کے نزدیک یہ کام نزول عیسیٰ اور ظہور مہدی کے دور میں ہو گا۔(32)

سلفی عالم دین اور مفسر قرآن مولانا عبد الرحمن کیلانی صاحب اپنی تفسیر، تیسیر القرآن،، میں سورہ توبہ کی آیت کی تفسیر میں رقمطراز ہیں۔

،،آپ کی بعثت کا مقصد اسلام کی نظریاتی اور سیاسی بالادستی :۔اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ نے رسول اس لیے بھیجا ہے کہ ساری دنیا کو مسلمان بنا کے چھوڑے۔ بلکہ یہ مطلب ہے کہ دنیا میں جو جو دین یا نظام ہائے زندگی رائج ہیں ان سب پر بلحاظ عقل اور دلیل و حجت اسلام کی بالادستی قائم ہو جائے۔ مثلاً دور نبوی میں یہودیت ایک دین تھا۔ عیسائیت، مجوسیت، منافقت، صائبیت، مشرکین کا دین۔ ان سب ادیان کے عقائد الگ الگ تھے۔ اور انہی عقائد کی مناسبت سے ان کا پورے کا پورا نظام زندگی ترتیب پاتا تھا۔ رسول کی بعثت کا مقصد اللہ کے نزدیک یہ ہے کہ ان تمام باطل ادیان کے نظام ہائے زندگی پر اسلام کی برتری اور بالادستی قائم کر دے۔ اور عقل اور دلیل و حجت کے لحاظ سے اسلام کی یہ برتری اور بالادستی آج تک قائم ہے۔ بیرون عرب ادیان باطل کی مثالیں۔ ہندوازم، سکھ ازم، بدھ ازم، جمہوریت اور اشتراکیت وغیرہ ہیں۔ ایسے سب ادیان پر اسلام کی برتری اور بالادستی کو بہ دلائل ثابت کرنا علمائے اسلام کا فریضہ ہے۔ یہ تو نظریاتی برتری ہوئی۔ اور سیاسی برتری کے لحاظ سے بھی اللہ نے اسے کئی صدیوں تک غالب رکھا۔ بعد میں جب مسلمانوں میں اخلاقی انحطاط اور انتشار رونما ہوا تو مسلمانوں

سے یہ نعمت چھین لی گئی۔اور اس کا اصول یہ ہے کہ جب تک اور جہاں تک مسلمان اپنے نظام زندگی اسلامی نظریات کے مطابق ڈھالیں گے اسی حد تک مسلمانوں کو غیر مسلم اقوام پر سیاسی بالادستی اور برتری حاصل ہو گی جس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام میں بالقوۃ یہ استعداد موجود ہے کہ وہ سیاسی طور پر بھی تمام غیر مسلم اقوام اور نظریات پر غلبہ حاصل کرے۔اگرچہ مسلمانوں کی عملی کوتاہیوں کی وجہ سے یہ استعداد بالفعل منظر عام پر نہ آسکتی ہو،،۔(33)

کیلانی صاحب نے اس آیت کی تفسیر میں اسلام کی علمی برتری کے ساتھ ساتھ سیاسی برتری کو بھی بعثت رسول کا مقصد اور پھر مسلمانوں کا مقصد بیان کیا ہے۔ یہاں پر ان کا سیاسی اسلام کی طرف جھکاؤ بہت صاف نظر آرہا ہے۔ اکثر مقامات پر کیلانی صاحب، مولانا مودودی کی تعبیر اسلام اور ان کی تفسیر سے بہت زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ مولانا مرحوم نے سورۃ الفتح اور الصف کی آیات کی تفسیر کے لیے سورۃ التوبہ کی اسی آیت کی تشریح کی طرف رجوع کا مشورہ دیا ہے۔۔ یہ کیلانی صاحب کی تفسیر ہے جبکہ اب اسی مسلک کے ایک اور بہت بڑے عالم اور مفسر جناب علامہ نواب صدیق حسن خانؒ (1248-1307ھ) نے اپنی تفسیر فتح البیان میں تمام وہی نکات بیان کیے ہیں جو سابقہ مفسرین سے منقول ہیں، اس میں انہوں نے نظام کی بات کی ہے اور نہ ہی یہ بتایا ہے کہ اسلام تمام نظاموں پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے آیا ہے۔

- قاضی ثناء اللہ پانی پتی (وفات 1225ھ): برصغیر کے مشہور حنفی عالم دین اور مفسر قرآن ہیں، آپ نے بھی مذکورہ آیت کریمہ کی تفسیر میں نہ اسلام کے سیاسی غلبہ کی بات کی ہے اور نہ ہی اسلام کو مکمل ضابطہ حیات اور اس کو باقی نظامہائے حیات پر غالب کرنے

کی طرف کوئی اشارہ فرمایا ہے۔ موصوف کے نزدیک غلبہ سے مراد ہمیشہ کا غلبہ نہیں ہے بلکہ اکثر اوقات میں غلبہ ہے اور یہ غلبہ اسلام کو حاصل ہوا ہے۔

۴ - مفتی محمد شفیع (1976-1897ء): مفتی صاحب موصوف کا تعلق بھی اسی مکتب فکر سے ہیں جس سے قاضی ثناء اللہؒ کا تھا اور مفتی صاحب نے اپنی تفسیر میں قاضی صاحب مرحوم کا حوالہ بھی دیا ہے، لیکن ان کے دور میں مذہب کی سیاسی تعبیر کا بہت زور تھا، اس لیے مفتی صاحب نے حکومت اور سلطنت کو اس غلبہ کے لوازمات میں سے قرار دیا ہے، لیکن پھر بھی آپ نے اسی کو مسلمانوں کا نصب العین نہیں قرار دیا۔

اسی طرح مولانا عبد الماجد دریا آبادی نے بھی اس سے اسلام کا فکری، علمی اور بلحاظ قوت غلبہ مراد لیا ہے، البتہ مادی غلبے کو اہل اسلام کی اہلیت اور صلاحیت کے ساتھ مخصوص و مشروط قرار دیا ہے۔

۵- محمد احمد ابو زہرہ (1974-1898ء): علمی دنیا میں ابو زہرہ کسی تعارف کے محتاج نہیں ہے، آپ 40 سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں۔ تفسیر بھی لکھنی شروع کی تھی، لیکن سورۃ النمل کی آیت نمبر 73 تک پہنچ کر آپ انتقال کر گئے، آپ نے اپنی تفسیر میں آیت کی تشریح میں کہیں اسلام کے سیاسی غلبہ اور نظاموں پر اسلامی نظام کے غالب آنے کی کوئی بات نہیں کی ہے۔ حالانکہ اس دور میں پوری مسلم دنیا میں اس سیاسی تفسیر کی گونج سنائی دے رہی تھی۔ اور مصر میں خاص طور پر الاخوان اور سید قطب نے غلبہ اسلام کو سیاسی حاکمیت کے معنوں میں مسلمانوں کا نصب العین بنا رکھا تھا۔

اہل تشیع مفسرین کا نقطہ نظر

مذکورہ تینوں آیات میں اظہار دین کے حوالے سے تمام قدیم اور جدید اہل تشیع مفسرین کا اتفاق ہے کہ اس سے مراد امام مہدی علیہ السلام کا زمانہ ظہور ہے۔ اس وقت اسلام تمام ادیان پر غالب آئے گا، مگر جدید مفسرین اہل تشیع اس تعبیر سے متفق رہنے کے باوجود کچھ ایسی گنجائش نکالتے ہوئے نظر آتے ہیں، جو ہمارے مذہبی سیاسی مفسرین کی تعبیر کے قریب قریب ہے۔ چونکہ اہل تشیع مفسرین عام طور پر متفق ہیں، اس لیے زیادہ حوالوں کی چنداں ضرورت نہیں۔

دور جدید کی ایک معروف اور بہت اہم تفسیر ،،الامثل،، سے ایک حوالہ ملاحظہ فرمائیں۔

آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی (1926ء): آیت اللہ شیرازی صاحب جدید اہل تشیع مفسر اور متکلم ہیں، انقلاب ایران کو کامیاب بنانے میں آپ نے اہم کردار ادا کیا اور آپ کی تفسیر اور دیگر علمی و فکری کتابیں اسلام کی سیاسی تعبیر سے بھرپور ہیں، لیکن آیت اظہار دین کی تفسیر میں آپ نے پرانی شیعہ فکر کی بھی بھرپور ترجمانی کی ہے، آپ نے اس آیت سے خروج امام آخر الزماںؑ اور اس وقت اسلام کے غلبے پر سیر حاصل بحث کی ہے اور اس پر وارد ہونے والے اعتراضات کا مفصل جواب تحریر فرمایا ہے، پوری تفصیل نقل کرنا تو ممکن نہیں ہے، اختصار کے ساتھ ان کا خیال ہے کہ یہ آیت مکمل اور ہر لحاظ سے غلبے کا تقاضا کرتی ہے۔ یہ غلبہ آج تک حاصل نہیں ہوا۔ وقتی اور محدود غلبے کو اس کا مصداق ٹھہرانا درست نہیں ہوگا۔ علامہ صاحب رقمطراز ہیں

"لہٰذا آیت کا صحیح مفہوم ہوگا، اسلام کا مکمل غلبہ تمام ادیان پر اور اس کا مطلب ہے اسلام تمام روئے زمین پر حکومت کرے گا اور تمام جہاں پر غالب آئے گا اور بلاشبہ یہ غلبہ موجودہ حالات میں حاصل نہیں ہے۔ لیکن ہم جانتے ہیں یہ اللہ کا حتمی وعدہ ہے جو پورا ہو کر رہے گا.....اسلامی مصادر میں موجود روایات کو سامنے رکھا جائے تو یہ چیز مکمل شکل میں امام مہدیؑ کے ظہور کے وقت حاصل ہوگی اور اس وقت اسلام کا غلبہ عالمگیر ہوگا"۔(34)

سید محمد مہدی موسوی خلخالی: سید محمد مہدی موسوی خلخالی صاحب نے ان آیات کی تعبیر میں متقدمین شیعہ علماء سے ہٹ کر راہ اپنائی ہے۔ اپنی کتاب "الحاکمیۃ فی الاِسلام" میں اسلامی حکومت کی ضرورت و اہمیت پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ اس کے بعد موصوف نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ یہ ضروری ہے کہ اسلامی حکومت، رسول، معصومین اور نائبین ائمہ کی زیر نگرانی قائم رہنی چاہیے تھی۔ اس کے بعد دو سوال اٹھاتے ہیں اور ان کے جواب میں موصوف نے آیات اظہار دین سے استدلال کیا ہے۔ پہلا سوال یہ کہ کیا اسلام کے اجتماعی احکام کا نفاذ اسلامی حکومت کی موجودگی کے ساتھ موقوف ہے؟ اور دوسرا سوال یہ کہ جب اسلامی حکومت نہ ہو تو مسلمانوں کی کیا ذمہ داری ہے؟ پہلے سوال کا جواب دیتے ہوئے خلخالی صاحب لکھتے ہیں :

"بے شک اسلام میں موجود فردی احکامات پر عمل کرنے کے لیے حکومت کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ فرد کے لیے ممکن ہے کہ وہ مسلمان رہ کر زندگی بسر کرے، البتہ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اسلام صرف فردی یا نجی احکامات پر مشتمل دین نہیں ہے، بلکہ یہ اجتماعی دین بھی ہے۔ یعنی اسلامی احکامات و قوانین کے لیے ضروری

ہے کہ اس کو پورے معاشرے میں مکمل نافذ کیا جائے، اس لیے کہ اسلام کی رو سے معاشرہ ایک کل کا نام ہے، جیسے قرآن نے صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ قرآن اس ہدف کا ذکر کرتا ہے اور وہ ہے خدا کے حکم سے اسلام کی سیادت تمام ادیان پر قائم ہو جیسے اللہ کا ارشاد ہے(48/29-28،،.۔(35)

اس کے بعد خلخالی صاحب بتاتے ہیں کہ قرآن میں یہ آیت تین مقامات پر ہے، ان آیات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام آیا ہی تمام مذاہب و ادیان اور انسانی معاشروں پر غالب ہونے کے لیے ہے اور یہ ہدف حاصل ہی اس وقت ہو سکتا ہے جب اسلام کے پاس حکومت و اقتدار ہو۔ اس کے بعد موصوف نے دوسرے سوال کا جواب دیتے ہوئے اسلامی حکومت کے قیام کو تمام مسلمانوں کی بنیادی ذمہ داری قرار دیا ہے۔

امین احسن اصلاحی (1904-1997ء)

آخر میں دور جدید کے ایک ایسے مفسر کی رائے پیش خدمت ہے جنہوں نے اپنی پوری زندگی فہم قرآن کے لیے وقف کر دی تھی، اصلاحی صاحب اپنی زندگی کی ابتدائی ایام میں مولانا مودودی سے بہت متاثر تھے۔ جماعت اسلامی میں اہم مناصب پر فائز رہے، مگر بعد میں اختلافات کے پیش نظر علیحدگی اختیار کی۔ مولانا اصلاحی صاحب لکھتے ہیں :

"اس آیت کے مضمون کی وضاحت سورۃ البقرۃ آیت نمبر 192 اور سورۃ الانفال آیت نمبر 39 کے تحت بھی ہو چکی ہے۔ وہاں ہم نے بتایا ہے کہ نبی ﷺ کی بعثت کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ سرزمین حرم کفر و شرک کی ہر آلائش سے پاک ہو جائے اور دین حق کے سوا اور دین یہاں غالب کی حیثیت سے باقی نہ رہے تا کہ دعوت ابراہیمی کا یہ مرکز،

دعائے ابراہیمی کے بموجب، تمام عالم کے لیے ہدایت اور روشنی کا سرچشمہ بن جائے۔ وہی بات یہاں فرمائی گئی کہ جس طرح یہ اہل کتاب اپنی پھونکوں سے خدا کے چراغ کو گل نہ کر سکیں گے، اسی طرح مشرکین عرب کی کوششیں بھی اس دین کو مغلوب نہ کر سکیں گی بلکہ یہ ان کی تمام کوششوں کے علی الرغم اس سرزمین کے ہر دین پر غالب ہو کے رہے گا"۔(36)

وقت کی قلت کے پیش نظر ان پر تفصیلی گفتگو ممکن نہیں۔ آپ ان آیات کی تفسیر کسی بھی قدیم مفسر کی تفسیر اور جدید سیاسی تعبیر والوں کے ہاں دیکھ لیجیے آپ کو یہ فرق بہت واضح طور پر نظر آئے گا۔

جوابی بیانیہ

سیاسی اسلام اور اس سے جو انتہا پسندی اور شدت پسندی سامنے آئی ہے اس کے ابھی تک مندرجہ ذیل جوابی بیانیے سامنے آئے ہیں۔ موجودہ مسلم اہل فکر کے درمیان یہ تمام بیانیے پائے جاتے ہیں۔

1: مکمل سیکولرازم۔ یہ ان مفکرین کا بیانیہ ہے جو اسلام کو بطور مذہب دیکھتے ہیں اور اسلام کا مقصد فرد سازی، تعلق مع اللہ اور اخلاقی اور عقائدی تعلیمات کا مجموعہ سمجھتے ہیں۔ ان کے مطابق بعثت انبیاء کا مقصد یہی ہے۔ انبیاء کرام کے نہ کوئی سیاسی عزائم تھے اور نہ ہی ان کا مقصد کسی خدائی حکومت کا قیام تھا۔

مصطفی عبدالرازق، محمد عابد الجابری، مہدی بازرگان، عبدالکریم سروش، ڈاکٹر فواد زکریا، مولانا وحیدالدین خان وغیرہ اسی موقف کے قائل ہیں۔

2: قدیم فقہی، کلامی اور تفسیری ذخیرے کی طرف رجوع۔ تمام مکاتب فکر جن کا قدیم فقہی، کلامی اور تفسیری مواد پر انحصار ہے اور وہ اجتہاد مطلق کے خلاف ہیں ان کے خیال میں یہ ایک صورت ہے جس سے ہم موجودہ مذہبی انتہا پسندی اور شدت پسندی سے نکل سکتے ہیں۔ جمہور روایتی سنی مسالک کا یہ موقف ہے۔

3: تصوف۔ کچھ اصحاب دانش کا خیال ہے کہ تصوف ہی وہ راستہ ہے جو موجودہ انتہا پسندی کا راستہ روک سکتا ہے۔ تصوف چونکہ وسیع المشربی اور وسعت قلب کی راہ ہے اور اس میں تزکیہ باطن کو انسانی زندگی کا مقصد اور منتہی سمجھا جاتا ہے اس لئے موجودہ مذہبی انتہا پسندی کا سد باب تصوف کے زریعے ممکن ہے۔ اہل تصوف اور تصوف سے متاثرہ لوگوں کا مؤقف۔

4: نئے سرے سے اصول و مناہج وضع کر کے ایک نئی تعبیر۔ محترم جاوید احمد غامدی صاحب اس کی نمایاں مثال ہیں۔ غامدی صاحب جہاد و قتال کے بہت سارے احکام، جزیہ، قتل مرتد وغیرہ کو قانون اتمام حجت کے تحت حضور اور خلفائے راشدین کے دور تک محدود کر دیتے ہیں۔

5: جزوی سیکولرازم اور جزوی اسلام، مقاصد اسلام، اجتہاد مطلق، پارلیمنٹ کو اجتہاد کا مکمل اختیار دینا۔ علامہ اقبال اور ڈاکٹر فضل الرحمن وغیرہ سے متاثر لوگ۔ محترم جاوید

اقبال مرحوم تو علامہ اقبال کے تصور پاکستان کو ایک مثالی سیکولر اسلامی ریاست کہتے تھے۔ان کے علاوہ اقبال کے ترقی پسند اور جدیدیت پسند شارحین وغیرہ کا مؤقف۔

:6ماقبل خمینی شیعہ فکر کے حاملین، جن کے خیال میں اسلامی نظام اور اسلامی حکومت کا حق صرف معصوم کو حاصل ہے۔ آیت اللہ جمیل حمود عاملی، آیت اللہ ڈاکٹر نیاز محمد ہمدانی، وغیرہ۔

مندرجہ بالا جوابی بیانیے کے علمبرداروں میں سے کچھ کے نزدیک حضور اکرم ص کی زندگی اور نبوت کے مقاصد میں سیاسی بالادستی کا حصول شامل ہی نہیں تھا۔ یہ چیز حاصل ہوگئی، آپ کا مقصد یہ نہیں تھا۔کچھ کے نزدیک یہ حضور اکرم تک مخصوص تھا، امت کے لئے نہیں، جیسے آیت اظہار دین، وقاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ، اور اس جیسی دیگر آیات حضور اکرم یا خلفاء راشدین اور سرزمین عرب تک مخصوص ہیں، جبکہ کچھ کے نزدیک سیاسی حاکمیت کا حصول نہ آپ کی زندگی کا مقصد اور ہدف تھا اور نہ ہی امت کا۔ہاں یہ خدا کا انعام ہے اگر حاصل ہو جائے تو اس کو خدا اور سول کے حکم کے مطابق اور اسلام کے احکام اجتماعی کے نفاذ کے لیے استعمال میں لانا مطلوب ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر اسرار احمد، خلافت کی حقیقت اور عصر حاضر میں اس کا نظام، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور، ط پنجم، 2006؛ ص11؛ 10

۲۔ عبد الرزاق، احمد محمد جاد، فلسفة المشروع الحضاري، المعهد العالمي للفكر الإسلامي، أمريكا، ط اول، 1995، ص508؛ ج1

۳۔ ابو حسام الدین طرفاوی، الغلو فی التکفیر، المظاہر والاسباب والعلاج، ص59، ط، ن

۴۔ وحید الدین خان، مولانا، گیارہ ستمبر کے بعد، ماہنامہ الرسالہ، جولائی 2007، ص 33

۵۔ ندیم، خورشید احمد، سیاسی اسلام، تصور۔ ارتقاء۔ مستقبل، واقبال انٹرنیشنل انسٹیٹیوٹ اینڈ ڈائلاگ انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد، ط 2019؛ ص 11

۶۔ عثمانی، مفتی محمد تقی، اسلام اور سیاسی نظریات، مکتبہ معارف القرآن کراچی، طبع جدید 2016، ص 194

۷۔ مولانا محمود حسن، دنیا کے نئے نقشے کی تعمیر، (اداریہ) عالمی جہاد کا داعی،، حطین،، شمارہ اول 1438ھ، ص5تا25

۸۔ ہمدانی، آیت اللہ ڈاکٹر محمد نیاز، ولایت فقیہ افسانہ وحقیقت ص 7

۹۔ رشید الخیون، 100 عام الاسلام السیاسی ص209 ج 1

۱۰۔ خلیل احمد حامدی، تحریکی لٹریچر عالم عرب میں، تکرہ سید مودودی، ترتیب وتدوین، جمیل احمد رانا۔ سلیم منصور خالد، مکتبہ معارف اسلامی لاہور، ط دوم، 2010؛ ص384؛ ج3

۱۱۔ قاضی جاوید، اسلام اور مغرب، فکشن ہاوس لاہور، ط2015؛ ص76

۱۲۔ تسخیری، آیت اللہ محمد علی، ایک فرد جو خود ملت تھا، ترجمان القرآن جلد نمبر 130، عدد10، شعبان1422ھ، اکتوبر2003، لاہور، ص69

۱۳۔ ایضاً ص63

۱۴۔ حامدی، خلیل احمد، تحریکی لٹریچر عالم عرب میں، تذکرہ سید مودودی، ص337؛ 338، ج 3

۱۵۔ خامنئ، سید علی، مقدمۃ ترجمۃ الإمام الخامنئی لکتاب،، المستقبل لھذا الدین،، رسالۃ، التقریب، طھران، العدد الثانی عشر، الدور الثالثۃ، 1996، ص13تا20

۱۶۔ محمد یسری، مکانۃ سید قطب لدی تیارات الشیعۃ المعاصرۃ وتاثیرانہ علیھا
Http// www. Raseef22.com/ politi

۱۷۔ خامنہ ای، سید علی، ڈھائی سو سالہ انسان، مقدمہ ص16

۱۸۔ مودودی، سید ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ط 46؛ ص 190؛ ج2

۱۹۔ ایضاً، ص370؛371؛ ج4؛ حاشیہ نمبر48

۲۰۔ ایضاً، تحریک آزادی ہند اور مسلمان، اسلامک پبلیکیشنز لاہور، ط اول، 2010، ص89؛ ج5

۲۱۔ سرار احمد، ڈاکٹر، منتخب نصاب، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور، ط اول2010؛ ص89، ج2

۲۲۔ طبري، ابو جعفر محمد بن جرير، جامع البيان عن تاويل آي القرآن، البحوث والدراسات العربية، بدار ھجر، قاھرۃ، ط اولی، 2001، ص422، ج11

۲۳۔ ایضاً، ص320، ج21

۲۴۔ ایضاً، ص616، ج 22

۲۵۔ قرطبی، أبو عبداللہ محمد بن احمد بن ابي بکر، الجامع لأحکام القرآن، ووٴسسۃ الرسالۃ، بیروت، لبنان، ط أولی، 2006، ص180، ج10

۲۶۔ ایضاً، ص340، ج19

۲۷۔ ایضاً، 444، ج20

۲۸۔ الخازن، علاؤالدین علي بن محمد بن إبراھیم، لباب التأویل في معاني التنزیل، دار الکتب العلمیۃ، بیروت لبنان، ط أولی، 2004، صو353؛345، ج2

۲۹۔ ایضاً، ص172، جز4

۳۰۔ ایضاً، ص288، ج 4

۳۱۔ الماوردي، ابوالحسن علي بن محمد بن حبیبا، النکت والعیون، دارالکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان، ص356، 355، ج2

۳۲۔ ایضاً، ص530، ج5

۳۲۔ سعیدی، علامہ غلام رسول، تبیان القرآن، فرید بک اسٹال لاہور، ط سادس، 2009؛ ص126، ج5

۳۳۔ عبدالرحمن کیلانی، تفسیر تیسیر القرآن، مکتبۃ الإسلام لاہور، ط2018، ص202، ج2

۳۴۔ الشیرازي، ناصر مکارم، آیت اللہ العظمی، تفسیر الأمثل، مدرسۃ الإمام علي بن ابي طالب، قم ایران، ط اول، 1426ھ، ص207؛206، ج11

۳۵۔ الخلخالی، السید محمد مهدي الموسوي، الحاکمیۃ في الإسلام، مجمع الفکر الاسلامی، قم إیران، ظ أولی، 1425ه، ص134؛133، ترجمۃ، جعفر الهادي

۳۷۔ اصلاحی، امین احسن، تدبر قرآن، فاران فاونڈیشن لاہور، ط نہم، 2002، ص 564، ج3

کاروبار، فری لانسنگ اور ڈیجیٹل اسکلز کے مواقع

اسامہ بن منصور

اسامہ بن منصور ایک انجینئر ہیں اور ڈیجیٹل مہارتوں کے حوالے سے وسیع آگاہی رکھتے ہیں۔ اس لیکچر میں انہوں نےنوجوانوں کی کاروبار کے پھیلتے مواقع کے بارے میں رہنمائی کی ہے کہ وہ اس جدید دنیا میں کمانے کے لیے جدید اور نئی مہارتوں اور طریقوں کا استعمال کریں۔ نوکری پیشہ افراد کے مسائل اور فرالانسنگ کے عمدہ مواقع پر بہترین انداز میں روشنی ڈالی ہے۔

پاکستان میں بے روزگاری کا بحران

میں پاکستان میں بے شمار ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو انجینئرنگ کر کے مجبوراً بیس سے پچیس ہزار ماہانہ پر بنک کی نوکری کر رہے ہیں جو ان کا شعبہ ہی نہیں ہے کیونکہ نوکری نہیں مل رہی۔ 31 فیصد (Percent) بے روزگار ہیں اور اسکا 51 فیصد خواتین (female)ہیں. جو پڑھی لکھی ہیں۔ لیکن وہ اس قابل نہیں کہ نوکری تلاش کر سکیں یا حاصل کر سکیں یا جس میں وہ اپنے کیریئر (career) کو بنا سکیں۔ پچھلے سال تقریبا ساڑھے سات لاکھ افراد اس ملک سے باہر چلے گئے تھے اور وہ اس لیے ہی گئے کہ جا کر نوکری کریں گے۔ لیکن وہی بات ہے کہ لوگوں کو کوئی موقع نظر نہیں آیا۔

نوکری پیدا کرنے والی ذہنیت

پھر بڑا سوال یہ اٹھتا ہے کہ ہم نوکری کے پیچھے تو پڑے ہوئے ہیں ایک ملازمت کی متلاشی ذہنیت کے حامل افراد کا طبقہ (Job seeker mind set) نوکری پیدا کرنے والی ذھنیت job creator mindset کیوں نہیں ہے۔ اب دنیا میں کامیاب ترین لوگوں کا بنیادی مقصد اپنے آپ کو آگے بڑھانا اور اس کے ساتھ ان کا مقصد ہوتا ہے کہ معاشرے کو بھی ترقی یافتہ بنائیں۔ مثال کے طور پر میں کوئی کاروبار شروع کرتا ہوں تو میں کسی کو نوکری پر (Hire) رکھتا ہوں۔ دو لوگوں کو رکھنے کا مطلب میں دو خاندانوں کی مالی مدد کر رہا ہوں. جس بندے کو میں نے نوکری پر رکھا ہے جو تنخواہ میں نے دی ہے اس سے اس کی فیملی بھی چلے گی۔ بجائے اس کے کہ میں اپنے بارے میں سوچوں، میرا تو فائدہ ہو رہا ہے اس کی وجہ سے کہ وہ بندہ میرے پاس کام کر رہا ہے ان کا بھی فائدہ ہو رہا ہے کہ میرے ذریعے وہ آمدنی پیدا کرنے کے قابل ہے جس سے وہ اپنی فیملی کی مالی مدد کر سکتے ہے۔

ہمیں اپنا نظریہ تھوڑا تبدیل کرنا ہوگا کہ اب نوکری کی متلاشی ذہنیت سے نکل کر ہمیں ایک نوکری پیدا کرنے والی سوچ کی طرف آنا ہوگا یہی وجہ ہے کہ آج کا موضوع کاروبار میں فروغ اور فری لانسنگ، (Entrepreneurship and Freelancing) کا تصور اور مواقع بہت اہمیت کا حامل ہے۔ میرا زیادہ زور کاروبار کے فروغ (Entrepreneurship) پر ہوگا۔ فری لانسنگ خود کاروبار میں فروغ کا ایک حصہ ہے۔ یہ انٹرپرینیورشپ کی طرف پہلا قدم ہے.

انٹرپرینیورشپ کیا ہے؟(What is Entrepreneurship?)

یہ منافع کمانے کے لیے خطرے کے ساتھ ساتھ کاروباری منصوبے کو بنانے، منظم کرنے،اور ترقی دینے کی صلاحیت اور خواہش ہے۔

یہ انترپرینیورشپ کی کتابی تعریف ہے کہ کسی بھی کام کرنے کی خواہش کا ایک معیار ہونا چاہئے ہے۔ کاروبار کرنے کی جرات،اس کا انتظام کرنا، چلانا اور ترقی دینے کی ہمت ہونی چاہیئے۔ ساتھ ساتھ جو خطرات ہیں ان کو بھی آپ نے مد نظر رکھنا ہے تاکہ آپ منافع حاصل کر سکیں. یہ تو کاروبار کی حد تک ہم نے تفصیل بیان کر دی ہے۔ لیکن یہ صرف کاروبار کی حد تک نہیں ہے بلکہ یہ تعریف میری اور آپ کی روزمرہ زندگی پر بھی پوری اترتی ہے۔ کیسے ؟ اگر اس میں سے کاروبار کو ہٹادیں اور اپنی زندگی لگادیں تو یہ نفع کمانے کے لیے خطرے کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی کی نشوونما اور انتظام کرنے کی خواہش کی صلاحیت ہے۔ ادھر نفع کیا ہوگا ؟۔ زندگی میں اپنی قدر میں اضافہ کرنا اور اپنی قدر میں اضافہ کیسے کر سکتے ہیں؟ علم میں اضافہ کر کے، اپنی صلاحیتوں کو بڑھا کر اپنی قدر میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ جس دن انسان نے یہ سمجھ لیا کہ مجھے بہت کچھ آتا ہے، انسان کی زندگی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ سیکھے، علم حاصل کرے تاکہ علم آگے لوگوں کو منتقل کر سکے۔ بعض لوگوں کی ذہنیت یہ ہے کہ وہ مسائل حل کرنے کی ضد کرتے ہیں۔ ہمارا مسئلہ کیا ہے؟ ہم اس طریقے سے اس ذہنیت کے ساتھ مسئلہ حل کر رہے ہیں جس ذہنیت کے ساتھ مسائل پیدا کیے ہیں،اس کی وجہ سے ہم آگے نہیں بڑھ سکتے، جب تک ہم اپنے علم میں اضافہ نہیں کریں گے، ہم مسئلے کے دوسرے رخ کو نہیں دیکھ سکیں

گے۔ جب تک ہم مسائل کو اکیلے ہی دیکھتے رہیں گے، نتیجہ وہی نکلے گا جیسا کہ نقطہ آغاز پر تھا۔

کاروبار (انٹرپرینیورشپ) کا فائدہ

اب انٹرپرینیورشپ کا مجموعی فائدہ کیا ہے؟ معاشی ترقی کا کیا فائدہ ہے، جو نظریاتی طور پر سماجی, عالمی کوششوں میں نظر آتا ہے۔ معاشی طور پر ملازمتیں پیدا ہوتی ہیں، جدت آتی ہے، اس کے ساتھ سماجی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں جو معاشرت پر اثرانداز ہوتی ہیں۔ سماجی ہم آہنگی کو فروغ دیتے ہیں جس سے انسان ترقی کرتے ہیں۔ جب مختلف پس منظر کے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ روابط کرتے ہیں، ایک ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے اور آخر میں معاشرے کو ترقی کی راہ پر لے جانے کی آزادی ہوتی ہے. اس ترقی کا تعلق صرف معاشی طور پر نہیں ہے اس کا تعلق باقی افراد اور معاشرے کی ترقی سے بھی ہے۔

انٹرپرینیورشپ کے تصورات

اب انٹرپرینیورشپ کے تصورات کی طرف آتے ہیں۔ بنیادی تصور کا تضاد کیا ہے؟ یہ کچھ نیا بنانے کا متحرک عمل ہے جس کی قدر ہوتی ہے۔ جب آپ قدر پیدا کریں گے اور لوگ اس چیز کو اپنالیں گے تو آپ بہتری کی طرف بڑھیں گے۔

دوسرا نکتہ ہے کی آپ مستقبل کے لیے چیلنج کا خطرہ مول لیں۔ کسی خیال کو حقیقت کی طرف لے کر آنے کا سوچیں۔ ہمارے ذہن میں روزانہ سینکڑوں خیالات آتے ہیں لیکن کیا ہم نے کبھی کسی خیال پر کام شروع کیا یا اس پر سنجیدگی سے کوئی اقدام کیا ہے۔

بنیادی طور پر انٹر پرینیور شپ اس سوچ کو شاندار حقیقت میں تبدیل کرنے کا نام ہے۔ لائحہ عمل بنانے میں نقصان کوئی نہیں ہوتا۔ یہ بہت ضروری ہے کہ ایک لائحہ عمل بنایا جائے. کہ آپ اپنا5 سالہ 10 سالہ منصوبہ بنائیں گے، کم از کم انسان کو اپنی سمت کا پتا ہونا چاہیے۔ جب تک انسان اپنا کوئی منصوبہ ہی نہیں رکھتا آگے اس کا کوئی مقصد ہی نہیں ہو گا۔

جب ایک انسان اپنا مقصد بناتا ہے، اس سے کیا ہو گا؟ ایک سوچ کا عمل شروع ہو گا جسے اختراع کہتے ہیں. اختراع کیا ہوتا ہے، اپنے آپ کو ان سر گرمیوں میں شامل کرنا، جو آپ کی خصوصیت، آپ کی شخصیت کو نکھارے گی۔ یہ انٹر پرینیور شپ کے بنیادی تصورات ہیں۔

جیم ماڈل *(Global Entrepreneurship Monitor)*

یہ ایک ماڈل ہے جسے جیم ماڈل (GEM) کہا جاتا ہے جسے ورلڈ اکنامک فورم نے بنایا ہے۔ کس طرح آپ کی قومی سطح کا انتظام کام کرتا ہے یا کام کرنا چاہئے۔ پہلے سماجی، ثقافتی، سیاسی سیاق وسباق کے بارے میں سوچنا اہم ہے۔

سماجی تناظر

آپ کے خیال میں پاکستان کا سماجی تناظر کیا ہے؟ ہمارا خاندانی ڈھانچہ ہوتا ہے کہ خاندان کا بڑا جو کہتا ہے، باقی گھر والے اس پر عمل کرتے ہیں۔ دراصل، یہ روزمرہ کی زندگی میں سماجی تناظر ہے۔ اب جو کچھ ہو رہا ہے اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ٹیکنالوجی اور ترقی کی

وجہ سے نوجوان نسل اب اپنے بڑوں سے سوال کر رہی ہے جو پہلے ایسا نہیں تھا۔ یہ بھی سماجی تناظر کا حصہ ہے۔

ثقافتی تناظر

ثقافتی تناظر کیا ہے؟ ہمارا ملک مختلف ثقافتی تناظر رکھتا ہے کیونکہ ہر صوبے کی اپنی ثقافت ہے۔ لیکن جب وہ اجتماعی طور پر سامنے آئے گی تب ہی ہم پاکستان کی مکمل اہمیت کو سمجھ سکتے ہیں۔

سیاسی تناظر

جو سیاسی تناظر ہے وہ جمہوریت ہے۔ جو ہمیشہ سے ہی غیر یقینی صورتحال رہی ہے جس کی وجہ سے ماضی میں کچھ ایسی چیزیں ایسی، ہوئی جو ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنی۔ پہلی چیز ثقافتی تناظر کی بنیاد پر سیاسی حل ہوتا ہے۔ پھر انسان اپنی بنیادی ضروریات کی طرف آتے ہیں جب آپ کو یہاں تین عوامل میں استحکام حاصل ہوتا ہے تو بنیادی ضروریات پوری ہو سکتی ہے . بنیادی ضروریات کیا ہیں؟، ادارے، ان کی ترقی، ان کے آپریشنز، انفراسٹرکچر، معاشی استحکام، قومی اور بین الاقوامی سطح پر حیثیت، ایک اور بنیادی ضرورت صحت اور بنیادی تعلیم ہے۔ جب انسان کی بنیادی ضروریات پوری ہو جائیں تو تب ہی وہ اگلے مرحلے پر توجہ مرکوز کر سکتا ہیں جو کہ کارکردگی میں اضافہ ہے۔ اس کے بعد ہم انسان ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک ایک قدم اوپر آتا ہے، اس کے سیاق و سباق، سہولیات، سامان اور مارکیٹ کی افادیت کیا ہے؟ آپ ایک دوسرے کے ساتھ

کیسے کام کر رہے ہیں؟ آپ آپس میں تجارت اور دوسرے ممالک کے ساتھ تجارت کیسے کر رہے ہیں؟

لوگ جو مارکیٹ میں کام کر رہے ہیں ان کی کارکردگی، خصوصیات اور مہارتیں کیا ہیں۔ پھر ہم مالیاتی منڈی میں کہاں آتے ہیں۔ اس وقت پاکستان کی مالیاتی مارکیٹ کب مسائل کا شکار ہے۔ مزدور ملک کی کارکردگی بڑھانے والے سمجھے جاتے ہیں جنھیں اس ملک کو ایک قدم آگے بڑھانا ہے اور پھر ٹیکنالوجی کو استعمال کرنا آنا چاہیے۔ ٹیکنالوجی میں آپ کہاں کھڑے ہیں؟ بیرون ملک لوگ مختلف چیزوں پر کام کر رہے ہیں اور آپ فرسودہ چیز کو ہی اپنا رہے ہیں۔

فری لانسنگ (Freelancing)

فری لانسنگ کا ایک پلیٹ فارم fiver جس پر 8 لاکھ پاکستانی موجودہ وقت میں کام کر رہے ہیں۔ فائیور کا ہیڈ کوارٹر اسرائیل میں ہے۔ اگر اسرائیل کہتا ہے کہ میں مزید پاکستان کے ساتھ کام نہیں کرنا چاہتا تو 8 لاکھ پاکستانیوں کا کیا ہوگا ان کا جو کاروبار ہے جو نظام چلا رہے ہیں، جو تھوڑے بہت پیسے کما رہے ہیں وہ ختم ہو جائے گا۔ کسی بھی انسان کی بنیادی ضروریات اور کارکردگی بڑھانے والے اس کو ایک حد تک ہی لے جا سکتے ہیں۔ وہ اس کی قومی سطح پر ایک حد تک نام اور مرتبہ بناتے ہیں۔ بین الاقوامی سطح پر اس کی حیثیت اس وقت تک برقرار رہے گی جب تک آپ مقامی طور پر، اندرونی طور پر مضبوط ہوں گے۔ یہیں سے آپ کی جدت پسندی اور انٹرپرینیورشپ کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ جب مقامی مارکیٹ اور مقامی معیشت پروان چڑھے گی، پیسہ گردش کرے گا، تب

کہیں جا کر بین الاقوامی سطح پر نام بنے گا۔ اس لیے انٹرپرینیورشپ اور اختراع بہت ضروری ہے۔ اس سے کیا ہوتا ہے جب مقامی سیاق و سباق پر چیزوں کو بڑھایا جاتا ہیں تو لوگوں کے رویے میں بھی مثبت تبدیلی آتی ہے۔ اسی سے سرگرمیاں پیدا ہونے لگیں گی، لوگ کام میں لگ جائیں گے، ایک دوسرے سے روابط ہوں گے، اجتماعی طور پر کاروبار شروع ہوں گے۔ بدقسمتی سے ہماری درمیان یہاں تک کہ خاندانوں میں بھی غیر ضروری مقابلہ بازی کا رجحان ہے جیسے بھائی بہن یا کزنوں کے درمیان مقابلہ بازی ہوتی ہے، اس کے نمبر زیادہ آ گئے یا تم پڑھائی میں پیچھے رہ گئے اس سے غیر ضروری مقابلہ بازی شروع ہو جاتی ہے جیسے ہم بے رحمانہ مقابلہ بازی کہتے ہیں cut-throat) (competition، جب کوئی دوسرا کامیاب ہو رہا ہوتا ہے تو بجائے اس کے کہ اس کی حوصلہ افزائی کی جائے یا سمجھیں کہ وہ کیسے کامیاب ہوا ہے ہم اس کی ٹانگ کھینچنا شروع کر دیتے ہیں اس سے کیا ہوتا ہے کہ جو محنت کی گئی ہوتی ہے وہ کم ہونا شروع ہو جاتی ہے اور ترقی رک جاتی ہے۔ جب آپ انٹرپرینیورشپ کے ذریعے نئے اقدامات کرنے میں مشغول ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ روابط قائم کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں تو مجموعی طور پر ترقی بھی کرتے ہیں۔ یہی نقطہ نظر ہے کہ کاروبار میں فروغ کے لیے ایجادات کیوں اہم ہیں۔

انٹرپرینیورشپ کے فوائد

انٹرپرینیورشپ کے دو فائدے ہیں، ایک ذاتی فائدہ اور دوسرا کمیونٹی فائدہ۔

- ذاتی فائدہ

ذاتی فائدہ آزادی ہے کسی بھی مالیاتی آزادی سے کاروباری افراد کھلے ذہن سے نئے خیال سوچتے اور ان پر کام کرتے ہیں۔

ہر بندہ معاشی خود مختاری چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے وہ خود ہی اپنا باس ہو اور خود امپلائی۔ خود اپنے ہاتھوں سے وہ کام کرے اس سے کیا ہوتا ہے کہ جب ذاتی کامیابی حاصل ہوتی ہے تو وہ آپ کو اندرونی خوشی اور تسکین دیتی ہے۔

دوسرا فائدہ وراثت پیدا کرنے کی صلاحیت ہونا ہے، بہت سے کاروباری افراد بنیادی طور پر ایک کاروبار کی تعمیر کرتے ہیں اور اس کی ترقی کے معاملات حل کرتے ہیں۔ ایک چیز جب شروع کر لی جاتی ہے تو اسے کوئی انسان ایک مقام تک ہی لے کر جا سکے گا اور اس کے بعد کوئی اور اسے لے کر چلے گا۔ یہ ذاتی فائدے ہیں۔

- کمیونٹی فائدے

کمیونٹی فائدے مندرجہ ذیل ہیں۔

1. جدت کے ذریعے اقتصادی ترقی میں تعاون کرنا جو کہ کمیونٹی کی ترقی کا حصہ ہے۔

2. دوسرے کاروباریوں کے لیے مواقع پیدا کرنے، ملازمتیں پیدا کرنے اور دیگر معاشی مواقع پیدا کرنے کی صلاحیت۔

3. ثواب یعنی دوسروں کے ساتھ اپنے علم کا اشتراک کرنے میں مدد کرنا ہے۔

جتنے بھی دنیا میں کامیاب ترین لوگ ہیں، کیا وہ علم حاصل کر کے اپنے پاس رکھتے ہیں؟ وہ اپنا علم دوسروں کے ساتھ بانٹتے ہیں ان کو سکھاتے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے پاس خود اپنے لیے کوئی تحریک نہیں ہے، لیکن سپورٹ ہر جگہ ہوتی ہے بس انسان کو اپنے لیے خود ڈھونڈنا ہوتا ہے۔ اپنے تعلیمی نظام میں اساتذہ آپ کی مدد کرتے ہیں لیکن باہر اپنی تحریک پر پڑھنا ہوتا ہے، ایک اصول ہے کہ جو زبانی طور پر کام کرتے ہیں، اسے عملی طور پر سوچنا ہوتا ہے کہ کسی طرح عملی طور پر کام کر کے مجموعی تبدیلی لا سکتے ہیں۔ اور اسی طرح ہم وسائل کا بہترین طریقے سے استعمال کر سکتے ہیں۔

کامیاب انٹرپرنیورز

- جیک ما Jack Ma

پہلا بندہ جیک ما Jack Ma ہے۔ جیک ما علی بابا سٹور کا مالک ہے جو ایک ای کامرس ویبسائٹ (E-Commerce Website) ہے۔ اس کا idea ہے کہ اس نے چائنہ کے اندر کیا اثرات پیدا کیے؟ 2000 میں ایک ریسرچ ہوئی تھی کہ 1999 تک چائنہ میں 1 ارب سے زیادہ آبادی تھی اور صرف 19 ملین، موبائل فون اور انٹرنیٹ صارفین تھے۔ اب چائنہ میں تقریباً 98% آبادی کے پاس انٹرنیٹ اور موبائل فونز ہیں۔ انہوں نے دیکھا کہ وہ کس طرح ترقی کر کے اوپر آ سکتے ہیں یہ جو ڈیجیٹل دور Digital era ہے اس میں کس طرح ہم نے ترقی کرنی ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ہمارے ملک میں کس طرح مالی معاملات کرتے ہیں۔ کس طرح پیسوں کو استعمال کرتے ہیں۔ پھر ڈیبٹ کارڈ/ کریڈٹ کارڈ Debit card/ Credit card کی طرف آجاتے ہیں کہ کس طرح ان

کے استعمال میں گھپلا ہو جاتا ہے۔ علی بابا کے ذریعے چائنہ نے محسوس کیا کی یہ چیزیں اتنی فائدہ مند نہیں ہیں۔ انہوں نے financial pin touch system بنایا۔ جو بھی paymentادائیگی ہو گی وہ QR code کے ذریعے ہوتی ہے۔ ہر بندے کے پاس موبائل فون اور انٹرنیٹ ہے اب وہ جو بھی ادائیگی کرتے ہیں موبائل فون کے ذریعے کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے گاؤں کے افراد بھی اسے استعمال کرتے ہیں۔ سب سے پہلے علی بابا نے گاؤں میں سہولیات مہیا کیں اس کی مثال یہ ہے کہ انہوں نے ایک گاؤں کا نام "ٹاؤ باؤ ویلج (Taobao Village) "یعنی ایک "مثالی گاؤں" رکھا ہے۔ ان کا انحصار خشک میوہ جات کی پیداوار پر تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ان کو پتہ ہی نہیں تھا کہ ایک گاؤں جو دور دراز علاقہ ہے میں اس کی پیداوار پورے چین میں کس طرح پہنچانی ہے۔ انہوں نے شہر میں رہنے والے لوگوں کو سہولیات مہیا کیں کہ وہ واپس اپنے گاؤں میں جائیں اور اپنا کاروبار شروع کریں۔ جب چند ایک لوگ اپنے گاؤں واپس گئے تو گاؤں والوں نے اعتراض کیا کہ شہر میں تمھاری اچھی ملازمتیں ہیں اور تم سب چھوڑ کر واپس گاؤں میں کیوں آ گئے ہو۔ تو ان لوگوں نے کہا کہ ہم جو کام شروع کرنے لگے ہیں آپ بھی اسے سمجھیں اور اس پر کام کریں اس کا فائدہ بعد میں آپ کو پتہ چل جائے گا۔ جب لوگوں کو سمجھ آنا شروع ہو گئی تو انہوں مخالفت ختم کر دیں اور ان کے پاس آنے لگے کہ ہمیں بھی اپنے کام میں شامل کریں۔ انہوں نے دیکھا کہ ہمارے پاس اچھی قسم کے خشک میوہ جات ہیں جو ہم دوسرے علاقوں میں پہنچا سکتے ہیں۔ انہوں نے اپنی پیداوار میں اضافہ کیا۔ کچھ لوگوں نے اپنے پودے لگائے۔ کچھ ان کو خشک کرنے اور صفائی کا کام کرنے لگ گئے۔ پھر انہوں نے ان کو چھلکے کے ساتھ اور کبھی بغیر چھلکے کے بیچنا

شروع کر دیا کہ چھلکے والے کم قیمت پر اور بغیر چھلکے والے زیادہ قیمت پر فروخت کرنے لگ گئے۔ کیونکہ چھلکا اتارنے میں محنت زیادہ لگتی ہے۔ انہوں نے ان میوہ جات کے ساتھ کاروبار کرنے کے لیے زیادہ محنت شروع کر دی۔۔ وہ لوگ جو اس مشورے کے ساتھ گاؤں چلے گئے تھے انہوں نے ان میوہ جات کو ای کامرس (E-commerce) کے ذریعے دوسرے علاقوں میں پہنچانا شروع کر دیا۔ اس طرح ان کا گاؤں "ٹائو بائو ویلج (Taobao Village) "بن گیا۔ اب اس گاؤں میں لوگ مل جل کر بڑے بڑے کارخانے لگا رہے ہیں۔ پہلے انہوں نے یہ تصور سمجھا پھر اس کو اپنایا۔ شروع شروع میں اس کی مخالفت ہوئی پھر آہستہ آہستہ لوگوں نے اپنانا شروع کر دیا۔ سب مل کر کام کریں گے تو ترقی ہو گی اور تبدیلی آئے گی۔ اسی طرح یہ خیال پورے چین میں پھیلا دیا گیا۔ اب علی بابا کے ذریعے جو چیز یہاں

پاکستان میں منگواتے ہیں وہ چین کے شہر سے نہیں گاؤں سے آپ کے پاس پہنچتی ہے۔ ٹائو بائو ماڈل (Taobao Model) اتنا زیادہ کامیاب ہو گیا ہے کہ پاکستان میں دراز ڈاٹ پی کے daraz.pk بھی علی باباوالوں نے اپنے ساتھ شامل کر لیا ہے۔

- ایلن ماسک Elon Musk

دوسرا بندہ ایلن ماسک ہے جو ٹیسلا موٹر (Tesla Motors)کا مالک ہے۔ ٹیسلا موٹر (Electric Cars) بجلی سے چلنے والی کاریں ہیں جو ماحولیاتی تبدیلی کے نظریے پر بنائی گئی ہیں۔ جو گاڑی پیٹرول یا گیس پر چل رہی ہیں، ان کی وجہ سے آب و ہوا خراب ہو رہی ہے اور ماحولیاتی آلودگی پھیل رہی ہے، اس کے متبادل کے طور پر بجلی سے چلنے والی گاڑی

کا خیال پیش کیا گیا۔ لوگوں نے شروع میں اس کو قبول نہیں کیا۔ ایلن ماسک نے اپنا پے پال (PayPal) بیچ کر ٹیسلا موٹر میں اپنا سرمایہ لگایا۔ شروع میں یہ کامیاب نہیں ہو سکی کیونکہ لوگ اس کو قبول ہی نہیں کر رہے تھے۔ لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری۔ اس نے ایک انٹرویو میں بتایا کہ "ایسا کئی بار ہوا کہ میں فیکٹری میں ہی سو جاتا تھا۔ مہینہ مہینہ میں گھر نہیں جاتا تھا۔ میں بس اس مفروضہ کو حقیقت میں تبدیل کرنا چاہتا تھا کیونکہ اس میں صرف میرا ہی فائدہ نہیں تھا بلکہ پورے معاشرے کی بھلائی پوشیدہ تھی۔

- سٹیو وجابز (Steve Jobs)

تیسرا بندہ سٹیو وجابز (Steve Jobs) ہے ایپل Apple)) کے سمارٹ فون کا تصور لے کر آیا ہے۔ وہ ٹیکنکل بندہ نہیں تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ کام کیسے کرنا ہے۔ کہاں سے وسائل لینے ہیں اور کس انسان کے مہارت استعمال کرنا ہے۔ اس طرح اس نے ایپل کو کھڑا کیا ہے۔

- جان کوم (John Koum)

آخری شخص جان کوم ہے جو واٹس ایپ (WhatsApp) کا مالک ہے۔ اس نے واٹس ایپ کیسے بنایا؟ یہ واحد انسان ہے جو ایک دستخط سے پانچ منٹ میں 19 بلین ڈالر کا مالک بن گیا تھا۔ جو ایک دن میں دنیا کے 150 بڑے ارب پتیوں میں شامل ہو گیا تھا۔ فیس بک (Facebook) نے 2014 میں جین کوم سے واٹس ایپ خریدنے کا معاہدہ کیا تھا۔ دستخط کرنے کا وقت آیا تو اس نے ایک عجیب شرط لگا دی اسکا کہنا تھا کہ وہ معاہدے پر دستخط شہر کی فلاحی عمارت میں بیٹھ کر کرے گا۔ فیس بک نے انکار کر دیا لیکن وہ اپنی

ضد پر قائم رہا یہ اس کہ پہلی اور آخری خواہش تھی۔ سودا بڑا تھا اور فیس بک یہ موقع ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا لہٰذا انھوں نے اس کی ضد مان لی اور کاغذات لے کر اس عمارت میں آ گئے، جان کوم انتظار گاہ میں سر جھکا کر ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ وہ لوگ اس کے قریب آئے اور کہا مسٹر جان ہم آ گئے ہیں جان کوم نے ٹشو پیپر سے اپنے آنسو صاف کئے قلم نکالا اور معاہدے کے کاغذات پر دستخط کر دیئے اور اس دستخط کے بعد 19 بلین ڈالر کا مالک بن گیا وہ اڑتیس سال کی عمر میں دنیا کے بڑے ارب پتیوں میں شامل ہو گیا۔ جان کوم یوکرائن کے ایک غریب یہودی خاندان میں پیدا ہوا۔ گھر میں بجلی، گیس، پانی کچھ نہیں تھا۔ گرمیاں گزر جاتی تھیں لیکن سردیوں میں ہمسایوں کے فارم ہاؤس میں بھیڑوں کے ساتھ لپٹ کر سوتا تھا کیونکہ ان کے پاس کمبل تک میسر نہیں تھا۔ 1992 میں یہ اپنی والدہ کے ساتھ امریکہ آ گیا اور کیلیفورنیا میں رہنے لگا امریکہ میں بھی ان کی فرصت کا وہی عالم تھا اور یہ لوگ خیرات پر پلنے لگے، صرف خیرات پر گزارہ مشکل تھا اس لیے جین کوم صفائی کا کام بھی کرنے لگا اور ساتھ ساتھ تعلیم بھی حاصل کرتا رہا۔ 18 سال کی عمر میں کمپیوٹر پروگرامنگ کے شوق کی وجہ سے اس نے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا تعلیم کے بعد وہ یاہو (Yahoo) میں بھرتی ہو گیا اس نے 9 سال یاہو میں کام کیا۔ 2004 میں فیسبک (Facebook) آئی اور آہستہ آہستہ مقبول ہوتے ہوئے 2007 میں دنیا کی سب سے بڑی کمپنی بن گئی۔ جان کوم نے فیسبک میں نوکری کے لیے درخواست دی لیکن اسے نوکری سے انکار کر دیا گیا۔ مزید دو سال جان کوم نے یاہو میں کام کیا۔ وہ آئی فون خریدنا چاہتا تھا لیکن پیسے نہ ہونے کی وجہ سے دوپہر کا کھانا بند کر کے تھوڑے تھوڑے پیسے جمع کرتا رہا اور اس نے آئی فون خرید لیا یہ آئی فون آگے چل کر

اس کے لیے سونے کی کان ثابت ہوا۔ فون استعمال کرتے ہوئے اس نے سوچا کیوں نا ایسی ایپلیکیشن بناؤں جو آگے چل کر فون کے متبادل بھی ہو اور جس کے ذریعے تحریری پیغام بھی بھیجا جا سکے۔ تصویریں بھی بھیجی جا سکیں۔ جسے کوئی ہیک (Hack) بھی نہ کر سکے۔ یہ ایک انوکھا خیال تھا۔ اس نے یہ خیال اپنے دوست برائن ایکٹون Brian Acton کو بتایا۔ یہ دونوں اس پر کام کرتے رہے اور کامیاب ہو گئے فروری 2009 میں یہ منظر عام پر آئی اور دیکھتے ہی دیکھتے مقبولیت کی تمام حدیں پار کر گئی۔ ٹیلی کمیونیکیشن میں ایک انقلاب آ گیا۔ دنیا کے 2 کروڑ افراد اس ایپلیکیشن کو استعمال کر رہے ہیں۔ یہ دنیا کی تیز ترین اور مقبول ترین ابلاغ ہے۔ اس کے ذریعے پوری دنیا کے ساتھ رابطہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ اس قدر کامیاب ہوئی کہ پوری دنیا کی کمپنیوں نے اس کی خریداری کے لیے بولی دینا شروع کر دی، لیکن وہ مسلسل انکار کرتا رہا۔ 2014 میں فیس بک بھی بولی لگانے والوں میں شامل ہو گئی اس کی انتظامیہ نے جب اس سے رابطہ کیا، کیونکہ فیس بک وہ ادارہ تھا جس نے جان کوم کا اس لیے نوکری دینے سے انکار کر دیا تھا کیونکہ ان کے خیال میں وہ اتنا ماہر نہیں تھا کہ اتنی بڑی کمپنی میں کام کر سکے۔ اس نے فیس بک کو ہاں کر دی 19 بلین ڈالر کا سودا ہو گیا۔ یہ جان کوم کی کہانی تھی۔ اس سے ہمیں کیا سیکھنے کو ملتا ہیں؟ کہ امیر ہونا مشکل کام نہیں۔ لیکن اس کے لئے سخت محنت کرنی پڑتی ہے۔ بہت سارے لوگوں کو غلط ثابت کرنا پڑتا ہے۔ ہم بیت الخلاء کی صفائی کرنے کے باوجود امیر بن سکتے ہیں۔

میں پندرہ سال ملک سے باہر رہا اور مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میں نے دوران تعلیم ایک سٹور پر کام کیا ہے۔ پرائم مارک Prime Mark ایک باہر کا کپڑوں کا برانڈ brand

ہے۔ یورپ میں اس کی 59 برانچیں ہیں میں نے اپنی بیچلرڈ گری کے دوران وہاں پر کام کیا ہے۔ غیر ملکی جو باہر جاتے ہیں انہیں ہفتے میں 20 گھنٹے کام کرنے کے اجازت ہوتی ہے۔ میرا ایک دوست ہے جو اپنی فیس ادا کرنے کے لیے تین نوکریاں کرتا تھا۔ اس وقت سالانہ 10 ہزار پاؤنڈ فیس تھی۔ وہاں پر جا کر ہم آرام سے کام کر لیتے ہیں لیکن یہاں پر یہ سب کرنا مشکل لگتا ہے ہماری چھوٹی سی آنا کو کام کرنے میں تکلیف ہوتی ہے کہ لوگ کیا کہیں گے۔ باہر کسی کو اس سے غرض نہیں ہے کہ کون کیا کر رہا ہے۔ تبھی وہ لوگ کامیاب ہیں۔ بلکہ حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ وہ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ پاکستانیوں کی اپنے ملک میں چھوٹے کام کرنے میں جان جاتی ہے لیکن بیرون ملک جا کر چھوٹے سے چھوٹا کام کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ وہاں کام کرنا پڑتا ہے اس کے بغیر گزارہ نہیں ہے۔

آئیڈیا بنا کر اکتانا نہیں

جان کوم کی مثال یہ ہے کہ اس نے اپنی تعلیم کو مکمل کرنے کے لیے سپر مارکیٹ میں جمعداری کام کیا۔ اس دوران اس کو آئیڈیا آیا اس نے اس پر کام کیا اور اس کو واٹس ایپ WhatsApp تیار کرنے میں دو سال لگے۔ دو سال میں اس نے کتنی معلومات اکٹھی کی ہوں گی کتنے لوگوں سے ملا ہو گا۔ کتنی محنت کی ہو گی اس سب میں ان کے ساتھ اس کی ثابت قدمی بھی شامل ہے۔ ہم لوگوں میں یہ چیز نہیں ہے ہم پاکستانی ایک آئیڈیا سوچ کر مہینہ دو مہینے اس پر کام کرتے ہیں پھر اکتا کر چھوڑ دیتے ہیں۔

کامیاب لوگ کس ذہنی سطح پر کام کرتے ہیں۔ ان کامیاب لوگوں میں کونسی صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ یہ کوئی اتنی مشکل بات نہیں ہوتی بس ان کامیاب لوگوں کی زندگی کچھ خاص اصول و ضوابط کے تحت گزرتی ہے۔ جس کی وجہ سے یہ دوسروں کے لیے قابل قدر مثال بن جاتے ہیں۔

دوسری بات یہ کہ جان کو م زندگی میں ایک خاص بلند مقام تک پہنچ گیا لیکن وہ اپنا ماضی نہیں بھولا اس نے اس فلاحی ادارے میں بیٹھے کر معاہدے پر دستخط کئے کیونکہ اس کی خواہش تھی، کہ جس جگہ سے اس کی والدہ نے شروعات کی تھی اسی جگہ بیٹھ کر میں بھی یہ سب نئی کامیابیوں کا آغاز کروں تاکہ میرے ذہن میں رہے کہ میں کہاں سے کہاں پر آگیا ہوں۔ بد قسمتی سے ہماری سوچ اتنی پست ہوتی ہے کہ ہم ذرا سی کامیابی حاصل کرتے ہیں تو ہماری انا اتنی بلند ہو جاتی ہے کہ ہم دوسروں کو کچھ سمجھتے ہی نہیں ہیں۔ اگر آپ کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو کسی بھی قیمت پر ہمیشہ عاجزی اختیار کرنا ہو گی تبھی آپ کو کچھ نیا سیکھنے کو ملے گا۔

تنظیم 'دخترانِ پاکستان' کا تعارف

ڈاکٹر فرخندہ ضیاء

ڈاکٹر فرخندہ ضیاء، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد میں شریعہ اکیڈمی کی ڈائریکٹر ہیں اور تنظیم 'دختران پاکستان' کی سربراہ ہیں۔ اس مختصر لیکچر میں انہوں نے تنظیم کا تعارف پیش کیا ہے کہ یہ کب وجود میں آئی، اس کے مقاصد کیا ہیں اوراس کے زیراہتمام اب تک کیا اقدامات کیے گئے ہیں۔

دختران پاکستان، ایک ایسا فورم ہے، جس کی اساس قرآن کے اصولوں، سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کے 1973 آئین میں ہیں۔ یہ قوم اور ریاست پاکستان کی مشترکہ سوچ اور متحد موقف کے طور پر کام کرتا ہے، اور تشدد، انتہا پسندی اور دہشت گردی کے خلاف متفقہ قومی بیانیہ "پیغام پاکستان" کی مکمل حمایت کرتا ہے۔ تمام طبقات پر تشدد انتہا پسندی اور دہشت گردی کے منفی اثرات سے متاثر ہوئے، مگر خصوصاً دانتہا پسندی اور ان مسائل سے نمٹنے اور روکنے میں خواتین کے کردار کو بسا اوقات نظر انداز کیا جاتا ہے۔ اس لیے اس مکالمے کا مقصد اس کے اہم کردار کو اجاگر کرنا ہے جو خواتین اس سے نمٹنے میں ادا کر سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ، یہ ان مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرتا ہے جو ریاست کے امن، خوشحالی اور مجموعی ترقی کو بری طرح متاثر کر رہے ہیں۔ یہ پر تشدد انتہا پسندی کے مسئلے پر قابو پانے کے لیے مختلف حکمت عملیاں فراہم کرتا ہے۔

دختران پاکستان کے اغراض و مقاصد:

- خواتین کو انتہا پسندی کے اثرات کے بارے میں تعلیم دینا: خواتین کو پر تشدد انتہا پسندی کے خطرات اور بنیاد پرستی کے ابتدائی انتباہی علامات کے بارے میں معلومات فراہم کرنا اور ان رجحانات کا مؤثر طریقے سے مقابلہ کرنے کے لیے انہیں بااختیار بنانا۔
- خواتین کے قیام امن میں کردار کو اجاگر کرنا: امن اور سماجی اصلاح کو فروغ دینے میں خواتین کی اہمیت پر زور دینا، انہیں پاکستانی معاشرے میں امن کے محافظ کے طور پر پیش کرنا۔
- خواتین کی تربیت: دخترانِ پاکستان کے پیغام اور اصولوں کو پھیلانے کے لیے خواتین کا ایک پر عزم فورم تیار کرنا، اس کے پیغام کو وسیع سطح پر پھیلانا۔
- تعلیمی تقریبات کا انعقاد: کانفرنسز، سیمینارز، ورکشاپس، اور تربیتی سیشنز کا انعقاد جن میں خواتین کے حقوق پر توجہ دی جاتی ہے۔
- خاندانی حرکیات میں خواتین کو بااختیار بنانا: خاندانی ڈھانچے میں خواتین کے اہم کردار کو تسلیم کرنا، انہیں بچوں کی پرورش اور ہم آہنگ گھریلو ماحول کو فروغ دینے میں اپنے مثبت اثر ورسوخ کو استعمال کرنے کے لیے بااختیار بنانا۔
- خود اعتمادی کو بڑھانا: خواتین کی خود اعتمادی اور مواصلات کی مہارتوں کو بڑھانا تاکہ بات چیت اور فیصلہ سازی کے عمل میں فعال شرکت کو ممکن بنایا جاسکے۔
- شمولیت کو فروغ دینا: تعلیم اور تربیت کے ذریعے مساعی کو آگے بڑھانا، سول سوسائٹی اور مقامی سیاسی سرگرمیوں میں خواتین کی شرکت کو آسان بنانا۔

باہمی تعاون کی کوششیں:

یہ دستاویز ریاستی اداروں، ممتاز یونیورسٹیوں کے ماہرین تعلیم، نامور مذہبی اسکالرز اور مختلف مکاتب فکر کے علمائے کرام کے متفقہ تعاون سے تیار کی گئی ہے، جس میں اہم ادارے حسب ذیل ہیں:

- رابطہ المدارس اسلامیہ پاکستان۔
- الہدیٰ انٹرنیشنل۔
- جامعہ فریدہ بنت الاسلام، ساہیوال
- جامعۃ المحسنات، کوئٹہ
- وفاق المدارس الشیعہ، لاہور۔
- جامعہ سراجیہ نظامیہ لاہور۔
- رابطہ المدارس خیبر پختونخوہ۔
- جامعہ نظامیہ رضویہ، شیخوپورہ۔
- جامعہ بنوریہ کراچی۔
- جامعۃ المنتظر لاہور۔
- جامعہ اشرفیہ لاہور۔
- جامعہ منہاج القرآن۔

"دخترانِ پاکستان" کا اصل مسودہ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے ریسرچ اسکالرز نے تیار کیا تھا اور اسے پہلی بار ایک قومی کانفرنس میں پیش کیا گیا تھا جس کا عنوان

تھا" پاکستان کا کردار"۔ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد میں 31 جنوری سے یکم فروری 2018 کو ایک پروگرام میں مختلف مکاتب فکر کے نامور علماء کرام اور علماء نے مشترکہ اعلامیہ پیش کیا اور اسے پاس کیا۔ مزید عملی تعاون اور استفادے کے لیے اسلامی نظریاتی کونسل، اسلام آباد اور پاکستان کی ممتاز یونیورسٹیوں کے فیکلٹی ممبران کے ساتھ مشاورت ہوئی۔

صدر پاکستان کی توثیق

23 اگست 2021 کو ایوان صدر میں منعقدہ تقریب میں عزت مآب صدر پاکستان ڈاکٹر عارف علوی کی طرف سے اس قومی ضابطہ اخلاق کی توثیق کی گئی، جو دختران پاکستان فرقہ واریت، انتہا پسندی اور دہشت گردی کے خلاف ایک پرامن اور ہم آہنگ معاشرے کی تشکیل کے لیے فراہم کرتا ہے۔

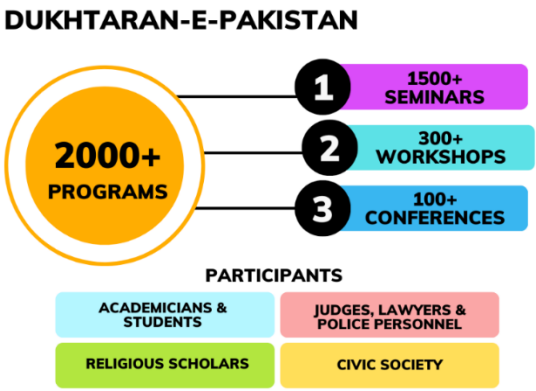

Figure 1: Dukhtaran-e-Pakistan Impact

آزادی فیلوشپ کے شرکاء کے تاثرات

- مقدس صمد خان

پروگرام ایسوسی ایٹ، انٹرنیشنل ریسرچ کونسل برائے مذہبی امور، اسلام آباد

آزادی فیلوشپ میں شرکت کرنا بلاشبہ میری زندگی کا اہم موڑ تھا۔ یہ صرف ایک پروگرام نہیں تھا۔ یہ ایک نئی دنیا سے میرا تعارف تھا، ایک ایسی دنیا جو مواقع اور علم سے بھری ہوئی تھی۔ اس فیلوشپ نے مجھے ایک ایسا ماحول فراہم کیا جہاں میں بہت کچھ سیکھ سکوں اور معاشرے مین اپنا کردار ادا کر سکوں۔ فیلوشپ نے اپنے متنوع موضوعات اور دل چسپ نشستوں کے ساتھ میری دلچسپی کو اور بڑھایا۔ ہر لیکچر اور مکالمے نے میرے فکری سفر پر گہرے نقوش چھوڑے۔ مختلف زاویوں، نظریات اور تجربات نے میری سوچ کو وسیع کیا اور میرے اندر سماجی مسائل اور اپنے معاشرے کے لیے کچھ کرنے ایک نیا جذبہ پیدا کیا۔ فیلوشپ کے سب سے اہم پہلوؤں میں سے ایک مصنف اور رپورٹر کے طور پر میری صلاحیت کا ادراک تھا۔ ساتھی فیلوشپ شرکاء کی طرف سے مجھے جو حوصلہ افزائی اور حمایت ملی اس نے مجھے کیریئر کے ایسے راستے پر جانے کا حوصلہ دیا جس کا میں نے پہلے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ مختلف سماجی مسائل کے بارے میں لکھنا نہ صرف ایک پیشہ بن گیا بلکہ ایک مشن بن گیا۔ مزید یہ کہ تمام فیلوشپ لیکچرز کو ایک کتابچے میں منتقل کرنے کا موقع اپنے آپ میں ایک سنگ میل تھا۔ اس نے نہ صرف میرے سیکھنے کی صلاحیت کو تقویت دی بلکہ مجھے پروگرام کے دوران حاصل کردہ علم کے پھیلاؤ میں واضح طور پر حصہ ڈالنے کی بھی ہمت دی۔ آزادی فیلوشپ نے اسلام آباد

میں مختلف علاقوں، ثقافتوں، نسلوں اور مذاہب کے شرکاء کے ساتھ سات دنوں تک مکمل بات چیت کرنے کا موقع ملا۔ ہم امید کرتے ہیں کہ IRCRA مختلف طریقوں سے پاکستان، اسلام اور دیگر مذاہب اور جمہوریت کی سالمیت کو متاثر کرنے والے منفی عناصر کو ختم کرے گا اور خوشحال پاکستان بنانے کی کوشش جاری رکھے گا۔

- تنویر ناصر

پی ایچ ڈی اسکالر، اسکول برائے جرنلزم اور نیو میڈیا، ژیان جیاؤتونگ یونیورسٹی، چین

بین الاقوامی ریسرچ کونسل برائے مذہبی امور (IRCRA) کے زیر اہتمام آزادی فیلو شپ پروگرام ایک بہترین پروگرام تھا، جس میں، میں نے بھی شرکت کی۔ IRCRA ان سرکردہ تنظیموں میں سے ایک ہے جو ہمیں معروف مقررین کے توسط سے مذہبی امور، جمہوریت، اسلاموفوبیا، قانون کی حکمرانی، فسادات، تشدد اور دہشت گردی کے خلاف جنگ کے بارے میں بصیرت افروز خیالات حاصل کرنے کے لیے ایک پلیٹ فارم (فیلوشپ) فراہم کرتا ہے۔ ہمیں آزادی فیلو شپ کے دوران IRCRA کی طرف سے پیشہ ور افراد، ماہرین، پالیسی سازوں، سابق سینیٹرز، سابق پارلیمنٹیرینز کے ساتھ بات چیت کرنے اور مختلف متعلقہ اداروں جیسے پارلیمنٹ، انسٹی ٹیوٹ آف ریجنل اسٹڈیز، اور فیصل مسجد کا دورہ کرنے کا موقع فراہم کیا گیا۔ بین الاقوامی ریسرچ کونسل برائے مذہبی امور کے زیر اہتمام ہمیں اسلام آباد میں مختلف علاقوں، ثقافتوں، نسلوں اور مذاہب کے شرکاء کے ساتھ سات دنوں تک مکمل بات چیت کرنے کا موقع بھی ملا۔

- امجد یاسین آفریدی

ایم فل سکالر اسلامک سٹڈیز، رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی اسلام آباد

انٹرنیشنل ریسرچ کونسل برائے مذہبی امور پاکستان کا ایک مایہ ناز ادارہ ہے اور پاکستان میں مختلف سطح پر مختلف پروگرامات کا انعقاد کرتا رہتا ہے۔ اسی سلسلے میں گزشتہ برس آزادی فیلوشپ کے نام سے اسلام آباد میں اکیسویں صدی کے مسائل، مذہبی آزادی، جمہوریت اور اسلام کے موضوعات پر 7 روزہ پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ آزادی فیلوشپ میں مختلف موضوعات پر بات کرنے کے لیے ماہرین کو مدعو کیا گیا تھا جس سے شرکاء خوب مستفید ہوئے۔ مختلف مذاہب اور نظریات کے لوگوں کا ایک جگہ اکٹھا ہونا اور ایک دوسرے کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آنا، ایک دوسرے کی رائے کا احترام کرنا اور ایک دوسرے کو سننا آزادی فیلوشپ پروگرام کی زینت تھا۔ جب معاشرے میں یہ چیزیں پائی جائیں تو معاشرہ پائیدار اور پرامن بن سکتا ہے کہ جس میں مختلف مذاہب، رنگ، نسل و زبان کے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ اچھی اور پرامن معاشرتی زندگی گزار سکتے ہیں۔

- نیلم آفریدی

انگریزی لیکچرار گورنمنٹ کالج برائے خواتین پلوسائی، پشاور

میرے لیے آزادی فیلوشپ کا تجربہ حیرت انگیز تھا۔ اس نے نئے افق کو تلاش کرنے اور مجھے نئے تجربات میں حصہ لینے کا موقع فراہم کیا۔ پروگرام کے دوران مختلف مقامات کے خصوصی دورے ناقابل فراموش تھے۔ دلکش نظاروں کے ساتھ آرام دہ رہائش، سیکھنے اور ترقی کے لیے ایک مثالی ماحول تھا۔ معیاری سہولیات کی فراہمی قابل تعریف ہے۔

- مسلم تاج

بانی فردوس ویلفیئر فاؤنڈیشن پشاور (ماحولیاتی تبدیلی)

فیلوشپ پروگرام میں حصہ لینے کے بعد، میری یہ رائے ہے کہ اس تجربے نے ہمیں نیا راستہ دکھایا اور ہماری شخصی تعمیر میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس پروگرام نے ہمیں معلوماتی مواد فراہم کیا، جو ہمیں اپنے معاملات کو بہتر بنانے میں مدد فراہم کرے گا۔ اس تجربے سے ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کی اہمیت کو بھی جانا۔

- ڈاکٹر نسیم اللہ

لیکچرار، اسلامک سٹڈیز ڈیپارٹمنٹ آف گورنمنٹ ڈگری کالج، بونیر

آزادی فیلوشپ پروگرام میں، میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ یہ پروگرام میری زندگی کا دلچسپ پروگرام تھا۔ اس میں بہت سے مذاہب و مسالک کے صاحبان نے شرکت کی۔ ملک کی اہم علمی شخصیات نے ہمیں لیکچرز دیے۔ اس میں غیر ملکی سفیروں نے بھی شرکت کی جن سے ہمیں بات کرنے کا موقع ملا۔

- شفیق آفریدی

سی ای او، ٹویوٹا خیبر موٹرز

آزادی فیلوشپ ورکشاپ میں شرکت میرے لیے ایک بہترین تجربہ رہا۔ پروگرام کے دوران میرا رابطہ دانشوروں، علما اور مختلف لوگوں سے ہوا۔ اس سے شرکاء کے درمیان ایک دوستانہ ماحول پیدا ہوا۔ مشترکہ سرگرمیوں اور نیٹ ورکنگ کے مواقع نے سیکھ میں اضافہ کیا۔ میرے سمیت باقی شرکاء نے مختلف موضوعات پر اپنے نقطہ نظر کا کھل کر

اظہار کیا، جس سے میری اور باقی شرکاء کی کافی غلط فہمیاں دور ہوئیں۔ اس تجربے نے میرے علمی افق اور فہم کو بہتر بنایا اور میں اس موثر تجربے کے لئے IRCRA کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

- ذیشان اخوند

آوٹ ریچ آفیسر

پاکستان میں مذہبی نفرت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے اور لوگ فرقوں میں بٹ چکے ہیں مگر اس فرقہ واریت کے دور میں انٹرنیشنل ریسرچ کونسل برائے مذہبی امور نے ایک ایسے فیلوشپ پروگرام کا انعقاد کیا جس میں مختلف مذاہب اور فرقوں سے نوجوانوں نے شرکت کی۔ ملک میں ایسے فیلوشپ پروگرامز کا انعقاد بہت ضروری ہے تاکہ نوجوانوں میں مذہبی ہم آہنگی پیدا ہو اور پرامن معاشرہ بنانے میں یہ نوجوان مثبت کردار ادا کریں۔ آزادی فیلوشپ کے شرکاء نے یہاں سے بہت کچھ سیکھا کیونکہ وہاں ان کو ہر مذہب کے لوگوں سے بات کرنے کا موقع ملا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مختلف مذاہب اور فرقوں کے نوجوانوں کو آپس میں بیٹھنے اور باتیں کرنے کا موقع ملا۔ میں خود پہلی بار ایک ہندو مذہب سے تعلق رکھنے والے پردیپ کمار سے ملا تو میرے ذہن میں جو ہندو کے بارے میں کچھ غلط تاثر تھا وہ ختم ہوا۔

- الطاف خان

سماجی کارکن و جنرل سکرٹری تحریک تحفظ حقوق شولگرہ چارسدہ

آزادی فیلو شپ پرو گرام اپنی نوعیت کا ایک امتیازی حیثیت کا حامل فلیو شپ پر گرام تھا۔اس میں بات چیت کے لیے ہمہ گیر موضوعات پر قابل اور بااثر شخصیات کو مدعو کیا گیا جس سے شرکاء کی علمی اور تحقیقی صلاحیتوں میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ IRCRA کی اس کاوش کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

- نوشین

ایم فل سکالر، یونیورسٹی آف ہری پور

میں 7 روزہ آزادی فیلوشپ پرو گرام میں شرکت کا موقع ملنے پر تہہ دل سے شکریہ ادا کرنا چاہوں گی۔ یہ میرے لئے ذاتی اور پیشہ ورانہ طور پر ایک قابل قدر اور بھرپور تجربہ تھا۔پرو گرام کو اچھی طرح سے ڈیزائن اور پیش کیا گیا تھا۔ میں نے ان ماہرین سے بہت کچھ سیکھا جنہوں نے مختلف موضوعات پر اپنے تجربات شئیر کیے۔ مجھے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ بات چیت کرنے میں بھی مزہ آیا، جو مختلف نقطہ نظر اور پس منظر سے تعلق رکھتے تھے۔ میں منتظمین خصوصا محترم محمد اسرار مدنی، ٹرینرز اور عملے کی کوششوں اور لگن کو سراہتی ہوں جنہوں نے اس پرو گرام کو ممکن بنایا۔

- غفران بیٹنی

سٹوڈنٹ پیس اینڈ کنفلیکٹ ڈپارٹمنٹ، پشاور یونیورسٹی

آزادی فیلوشپ میں میرا تجربہ بہت اچھا رہا کیونکہ اس فیلوشپ میں ہر طبقے فکر، سوچ اور علاقے کے لوگ تھے۔ جن کے ساتھ علمی اور سماجی گفتگو کر کے بہت کچھ سیکھا، اس کے

علاوہ آزادی فیلوشپ میں جو تبیت کار تھے وہ سب اپنے شعبے میں کافی نمایاں نام تھے جس سے ہمیں بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔

- پردیپ کمار

تاجر اور اقلیتی برادری کے سماجی کارکن

آزادی فیلوشپ کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ یہ سات دنوں کا تجربہ بہت اہم اور مفید ثابت ہوا۔ اس نے ہمیں مختلف موضوعات پر علم اور تجربات فراہم کیے۔ ہمیں اس قابل بنایا کہ ہم اپنی روزمرہ زندگی اور سماجی تعلقات میں بہتری لا سکیں۔ اس پروگرام نے ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنا سیکھایا، جو ہماری شخصیت کو بہتر بنانے میں مددگار ثابت ہوا۔ امید ہے کہ اس طرح کے فیلوشپ کے مزید پروگرام منعقد ہوتے رہیں گے۔

- عبداللہ اقبال

طالب علم بین الاقوامی سیاسیات، ضلع کرم، خیبر پختونخوا

انٹرنیشنل ریسرچ کونسل برائے مذہبی امور کے زیر اہتمام آزادی فیلوشپ بعنون "جمہوریت اور مذہبی آزادی کی تفہیم" جس میں مختلف مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے اہل علم اور طلبہ نے شرکت کی ایک دلچسپ پروگرام تھا۔ بین الاقوامی معیار کی اس فیلوشپ میں میرا پہلا تجربہ تھا جس میں یقیناً بہت کچھ سیکھنے کو ملا اور چونکہ میرا تعلیمی پس منظر بھی سیاسیات اور سماجیات سے ہی متعلق ہے تو حسنِ اتفاق سے اس پروگرام میں بھی زیادہ تر سیاسیات اور سماجیات کے متعلق لیکچرز تھے۔ مذہب کے متعلق بھی سیر

حاصل گفتگو ہوئی۔ ان تمام لیکچرز کے علاوہ ملک بھر کے مشہور تعلیمی مراکز میں مطالعاتی دورہ بھی ہوا جس سے زبردست آگہی حاصل کا موقع ملا۔

- ارسلان اورکزئی

آپریشنز مینیجر اراضی ایسوسی ایٹس، اسلام آباد

آزادی فیلوشپ میں شریک ہونے کا تجربہ میرے لئے بہت اثرانگیز رہا۔ اس سفر نے میری شخصی تعمیر اور نقطہ نظر پر گہرے اثرات ڈالے ہیں۔

آزادی فیلوشپ نے ایک خوش آیند ماحول فراہم کیا، جہاں آزادانہ ماحول میں مکالمے کی اجازت ملی، جس نے مجھے آزادی، شناخت اور اتحاد کی پیچیدگیوں کو ایسے طریقے سے سمجھنے کا موقع ملا جو معیاری تھا۔ ساتھی شرکاء کے ساتھ ایک ساتھ مشترکہ تجربات نے کمیونٹی کے باہمی حقیقی احساس کو جنم دیا، اور ایسے روابط کو فروغ دیا جو میری روزمرہ کی زندگی میں بہت اہم ہیں۔

- فواد علی باچا

طالب علم، جرمنی

میں نے 10 سال تک خیبر پختونخواہ کے مختلف علاقوں میں کام کیا ہے۔ آگہی کے کئی پروگرامز دیکھے اور سروے کرائے گئے۔ لیکن مجھے سب سے اچھا موقع انٹرنیشنل ریسرچ سنٹر برائے مذہبی امور کے آزادی فیلوشپ پروگرام میں ملا۔ ہمارے شرکاء کا تعلق مدارس، یونیورسٹیوں سمیت کئی مختلف شعبوں سے تھا، اقلیتی برادریوں کے نمائندے، مختلف این جی اوز میں کام کرنے والی خواتین کو ایک ساتھ دیکھنا خوشگوار

تجربہ تھا۔ یہ ہمارے لیے ایک نتیجہ خیز اجتماع تھا اور معاشرے کی بہتری کے لیے پورے ملک میں اسے جاری رکھنا چاہیے۔

- فرحان اللہ

صحافی، بیورو چیف، ریڈیو پروڈیوسر

میں ایک صحافی ہوں اور پختونخوا ریڈیو پشاور میں بطور پروڈیوسر، جب کہ ڈیلی کیپیٹل پوسٹ کے ساتھ بطور بیورو چیف پشاور کام کرتا ہوں۔ میں نے پشاور یونیورسٹی سے جرنلزم اور ماس کمیونیکیشن میں ماسٹر کیا ہے۔ آزادی فیلوشپ ایک منفرد تجربہ تھا جہاں میں نے بین المذاہب ہم آہنگی اور رواداری کی بہت سی مثالیں دیکھیں اور سیکھیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے دوست بھی اس طرح کے پروگرام میں شامل ہوں۔

- عدنان

طالب علم سیاسیات

سیاسیات کے ایک طالب علم کے طور پر، میں بین الاقوامی ریسرچ کونسل برائے مذہبی امور (IRCRA) کی طرف سے آزادی فیلوشپ پروگرام کو ایک انتہائی مؤثر قدم سمجھتا ہوں۔ اسلام آباد میں منعقد یہ پروگرام مذہبی تعلیم سے بڑھ کر قیادت اور سماجی ذمہ داری کے بارے میں قابل قدر تجربہ پیش کرتا ہے۔ پروگرام کے دوران اسکالرز کے ساتھ بات چیت سے نہ صرف تنقیدی سوچ میں اضافہ ہوا بلکہ عقیدے کے بارے میں بامعنی بات چیت اور نقطہ نظر کو وسعت دینے میں بھی مدد ملی۔ شرکاء کے ان کے اپنے آبائی اضلاع میں مرتب کردہ منصوبوں کے ٹھوس نتائج، اس پروگرام کی تاثیر کو

واضح کرتے ہیں۔ آزادی فیلوشپ علم، اتحاد اور ترقی کی علامت ہے، جو لیڈروں کی اگلی نسل کو بااعتماد بنائے گی۔ آئی آر سی آر اے نوجوانوں کو مذہبی اور معاشرتی طور پر باہنر بنانے اور پروان چڑھانے کے اپنے اس عزم کے لیے تعریف کا مستحق ہے۔

ایجنڈا 'آزادی فیلوشپ' پروگرام 2023ء

اس پروگرام میں سات دن تک مختلف مکالمے اور لیکچرز کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ساتھ میں مختلف مقامات کے دورے اور دیگر سرگرمیاں بھی شامل تھیں۔ ان ایام میں دیے گئے لیکچرز کی مکمل فہرست یہ ہے:

- پہلا دن

موضوع: افتتاحی کلمات اور فیلوشپ کا تعارف واہداف

لیکچر: ڈاکٹر فرخندہ ضیاء (ڈائریکٹر شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد)

لیکچر: ڈاکٹر محمد الیاس (ڈائریکٹر دعوہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد)

لیکچر: محمد اسرار مدنی (صدر انٹرنیشنل ریسرچ کونسل برائے مذہبی اُمور)

مکالمہ، تربیت اور تشکیلِ بیانیہ

لیکچر: سید رشاد بخاری (ڈائریکٹر انٹرنیشنل ریسرچ کونسل برائے مذہبی اُمور)

- دوسرا دن

موضوع: مسلم دنیا میں جمہوری تبدیلیاں، پاکستان میں جمہوریت کا مستقبل

لیکچر: خورشید ندیم (چیئرمین رحمت للعالمین وخاتم النبیین اتھارٹی)

لیکچر: محمد اسرار مدنی

موضوع: اسلامی ریاست اور آئینِ پاکستان میں تکفیر کا مسئلہ:

لیکچر: ڈاکٹر محمد الیاس

لیکچر: تحمید جان (دانشور، تربیت کار)

لیکچر: شمس الدین حسن شگری (اسکالر و مصنف)

- تیسرا دن

موضوع: بین الاقوامی تعلقات اور قوانین؛ پاکستان کے تناظر میں جائزہ

لیکچر: احمر بلال صوفی (قانون دان، سربراہ ریسرچ سوسائٹی آف انٹرنیشنل لاء)

موضوع: مدرسہ اصلاحات اور پاکستان کو درپیش چیلنجز اور مواقع

لیکچر: میجر جنرل (ر) غلام قمر (ڈائریکٹر، ڈائریکٹوریٹ برائے مذہبی تعلیم)

موضوع: آسٹریلیا میں اسلام: تاریخ، مذہبی ہم آہنگی اور چیلنجز

لیکچر: نیل ہاکنز (آسٹریلین ہائی کمشنر، اسلام آباد)

- چوتھا دن

مختلف مقامات اور اداروں کا دورہ

- پانچواں دن

موضوع: صنفی مساوات اور خواتین کی شمولیت

لیکچر: شبانہ عارف (ماہر امورِ نسواں، نیشنل کمیشن برائے امور خواتین)

موضوع: تنظیم 'دخترانِ پاکستان' کا تعارف

لیکچر: ڈاکٹر فرخندہ ضیاء

موضوع: عالمی تناظر میں علاقائی استحکام، پاک افغان سرحدی مسائل

لیکچر: الیگزینڈر اگانٹ (سربراہ شعبہ 'علاقائی استحکام' برطانوی ہائی کمیشن، اسلام آباد)

موضوع: قومی سلامتی کا منظر نامہ/اعداد و شمار

لیکچر: عبداللہ خان (مینجنگ ڈائریکٹر 'پاکستان انسٹی ٹیوٹ فار کنفلکٹ اینڈ سکیورٹی اسٹڈیز')

موضوع: بین الاقوامی تعامل میں مذہب کا کردار

لیکچر: ڈاکٹر ماہان مرزا (ڈائریکٹر 'انصاری انسٹی ٹیوٹ' نوٹرے ڈیم)

موضوع: ثالثی کے عمل میں اقوام متحدہ کا کردار

لیکچر: ڈاکٹر لوری ناتھن (سربراہ شعبہ 'ثالثی پروگرام' نوٹرے ڈیم یونیورسٹی)

- چھٹا دن

موضوع: کاروبار، فری لانسنگ، اور ڈیجیٹل اسکلز کے مواقع

لیکچر: اسامہ بن منصور (انجینئر، فری لانسر)

موضوع: پاکستان میں مذہبی آزادی اور بین المذاہب تعلقات

لیکچر: کرسٹوفر شیرف (کرسچن اسٹڈی سنٹر)

لیکچر: ڈاکٹر غلام شمس الرحمان (پروفیسر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد)

موضوع: خلافت یا قومی ریاست

لیکچر: ظفر اللہ خان (سابق وفاقی وزیر برائے قانون، مصنف)

موضوع: پاکستان میں میڈیا کا کردار

لیکچر: سبوخ سید (سینئر صحافی، تربیت کار)

لیکچر: تیمور شجاع (سینئر صحافی)

- ساتواں دن

گزشتہ لیکچرز اور مکالمات کا خلاصہ اور شرکاء کے تجربات و تاثرات

تصاویر

FELLOWSHIP

What Is “Azadi Fellowship” Progmam?

Last year, the “International Research Council for Religious Affairs” hosted a week-long fellowship program called 'Azadi Fellowship' from May 22 to May 28. Young people from Khyber Pakhtunkhwa and the former FATA representing diverse perspectives participated. The program aimed to foster unity and understanding while addressing issues of justice, freedom, and democracy. Participants engaged in open discussions and activities, gaining insights into each other's beliefs. Notable scholars, including lawyers, diplomats, and journalists, were invited to share their expertise.

The Azadi Fellowship continues this year and will become an annual event, welcoming youth nationwide. This year (2024), the program is being launched on a larger scale with additional enhancements.

This book contains written versions of some lectures delivered by guest teachers from the previous year. It is anticipated that these initiatives by the organization will have a positive impact on society and contribute to achieving our goals of change.

آزادی فیلوشپ (ii) کے شرکاء

- مصور حمید

مصور حمید نے گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور سے سیاسیات میں ایم فل کی ڈگری حاصل کی ہے۔ وہ اس وقت 'بلوچستان تھنک ٹینک نیٹ ورک' کوئٹہ، میں بطور ریسرچ آفیسر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس سے پہلے، انھوں نے وزارت منصوبہ بندی، ترقی، اور خصوصی اقدامات اسلام آباد میں خدمات انجام یں۔ اسلام آباد پالیسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (آئی پی آر آئی) اور انسٹی ٹیوٹ آف اسٹریٹجک اسٹڈیز اسلام آباد (آئی ایس ایس آئی) میں بھی کام کرتے رہے ہیں۔

- ماہنور بلوچ

ماہنور بلوچ کا تعلق کوئٹہ، بلوچستان سے ہے۔ ماہنور نے بلوچستان یونیورسٹی سے بلوچی زبان اور ادب میں ایم فل کی ڈگری حاصل ہے۔ انہوں نے بلوچستان یونیورسٹی میں بطور وزٹنگ لیکچرر کے ساتھ، بلوچستان نیوٹریشن ڈائریکٹوریٹ کے ساتھ TSFP اسسٹنٹ کے طور پر بھی کام کیا ہے۔ تھنک ٹینک 'پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس اسٹڈیز' (PIPS) سے بھی منسلک رہی ہیں۔ خواتین کو بااختیار بنانے کے لیے اپنی خدمات پیش کر رہی ہیں، خاص طور پر ان لوگوں کے لیے جو بلوچستان کے پسماندہ علاقوں سے ہیں۔

- شاری بلوچ

شاری کا تعلق تربت بلوچستان سے ہے اور تربت یونیورسٹی میں تدریسی خدمات انجام دے رہی ہیں۔انہوں نے کئی قومی سطح کے فلیٹ فارمز پر تربت کی نمائندگی کی ہے۔ حال ہی میں 'سوشل انوویشن اکیڈمی' کے زیر اہتمام مسابقتی پروگرام میں تیسری پوزیشن حاصل کر چکی ہیں۔

- فہد حسن

فہد حسن پنجگور، بلوچستان سے تعلق رکھتے ہیں، مدات انسانیت فاؤنڈیشن کے بانی ہیں، جو کہ کتابیں، فیس اور دیگر ضروری وسائل فراہم کر کے یتیموں کی تعلیم کی پر توجہ مرکوز کرنے والی ایک فلاحی تنظیم ہے۔امن اور انسانی حقوق کے فروغ کے لیے پر عزم کارکن کے طور پر وہ ہر شہری کے لیے مساوی تعلیم اور منصفانہ سلوک کے فروغ کے لیے کوشاں ہیں۔

- فرید بگٹی

بلوچستان کے شہر ڈیرہ بگٹی سے تعلق رکھنے والے فرید بگٹی نے بلوچستان یونیورسٹی سے پولیٹیکل سائنس میں ڈگری حاصل کی ہے۔ وہ ایک سیاسی اور سماجی کارکن کے طور پر نوجوانوں کے مسائل کو حل کرنے پر کام کر رہے ہے۔اس وقت وہ پاک ایران یوتھ فورم کے صدر اور مجلس فکر و دانش کے کوآرڈینیٹر کے طور پر خدمات انجام دے رہے ہیں جو باہمی تعلقات اور ثقافتی تبادلے کے حوالے سے پروگرام ترتیب دیتے ہیں۔

- مولانا عبدالکریم

مولانا عبدالکریم کا تعلق ضلع چمن، بلوچستان سے ہے۔ انہوں نے اسلامی تعلیمات کے ایک ممتاز ادارے، جامعہ دارالعلوم حقانیہ، نوشہرہ سے گریجویشن کی ہے۔ بلوچستان بورڈ سے ایف ایس سی اور علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے اے ٹی سی سی کیا ہے۔ دینی اور جدید تعلیم دونوں پر عبور رکھتے ہوئے وہ تدریس اور عملی سماجی کوششوں کے ذریعے امن اور ہم آہنگی کو فروغ دینے کے لیے کام کر رہے ہیں۔

- نازیہ حیات

نازیہ حیات، وسطی ہنزہ سے تعلق رکھنے والی، ایک کنٹینٹ رائٹر اور ڈیجیٹل پلیٹ فارمز کی مصنفہ ہیں۔ انہوں نے خصوصی افراد کے معیارِ زندگی اور تعلیمی مسائل پر تحقیق کی ہے۔ نازیہ نے راولپنڈی میں آغا خان لوکل ایجوکیشن بورڈ کے لیے انگریزی زبان کی استاد کے طور پر اور بین الاقوامی اداروں کے لیے فری لانس کنٹینٹ رائٹر کے طور پر کام کیا ہے۔ اس وقت نازیہ پاکستان میں 'ارلی برڈ رائیڈرز سائیکلنگ کلب' کی خواتین کی کہانیوں کو تحریری شکل دے رہی ہیں۔

- محمد زمان

محمد زمان باجوہ ایک تجربہ کار میڈیا پروفیشنل اور پالیسی اسپیشلسٹ ہیں۔ انہوں نے میڈیا اور ترقیاتی شعبے کے مختلف منصوبوں کے لیے رابطہ کاری کی ہے۔ اس وقت وہ سرکاری ٹی وی PTV NEWS سے وابستہ ہیں۔ ان کی تعلیم UMT ملائیشیا میں پی ایچ ڈی امیدوار (پالیسی اور ماحولیات کا انتظام) سے ہے۔ ان کا تعلق بہاولپور سے ہے۔

- عاقب احمد

عاقب احمد میر پور، آزاد جموں و کشمیر سے تعلق رکھتے ہیں۔ بین الاقوامی تعلقات میں بیچلرز کی پڑھائی کر رہے ہیں۔ طلبہ تنظیموں کا سرگرم حصہ رہے ہیں۔ عوامی سطح پر اور بالخصوص طلبہ میں شہریت اور حقوق کی آگہی کے لیے کام کرتے رہتے ہیں۔

- مہوش جاوید

کراچی، سندھ سے تعلق رکھنے والی مہوش جاوید نے جامعہ کراچی سے سوشیالوجی میں ماسٹر آف آرٹس کیا ہے۔ ایک سماجی تنظیم 'اسلامک ریلیف پاکستان' کے ساتھ مختلف کمیونٹی سرگرمیوں میں سرگرم حصہ دار کے طور پر منسلک ہیں۔ فی الحال، وہ IRISS کے ساتھ انٹرن کے طور پر کام کر رہی ہیں۔

- محمد حمزہ

محمد حمزہ (سالارزئی) تخت بائی، خیبر پختونخوا سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے پشاور یونیورسٹی سے سیاسیات میں ڈگری حاصل کی ہے۔ وہ ایک سماجی تنظیم کے شریک بانی کے طور پر سیاسی اور سماجی حوالے سے خدمات انجام دیتے ہیں۔

- ڈاکٹر سویرا پرکاش

بونیر، خیبر پختونخواہ سے تعلق رکھنے والی ڈاکٹر سویرا پرکاش نے AIMC سے MBBS کی ڈگری حاصل کی ہے۔ اس نے اپنے علاقے سے پہلی خاتون اقلیتی امیدوار کے طور پر 2024 میں عام انتخابات میں حصہ لیا، اور "بونیر کی بیٹی" کا خطاب حاصل کیا۔

ڈاکٹر پرکاش انسانی حقوق، بالخصوص خواتین کے حقوق، اور اقلیتی حقوق کے لیے پرجوش وکیل ہیں،اور مساوات وانصاف کے فروغ کے لیے کوشاں ہیں۔

- راج اسنانی کمار

راج اسنانی کمار کا تعلق تھرپارکر، سندھ سے ہے۔ مذہبی تنازعات سے نمٹنے اور کمیونٹی کی فلاح و بہبود کے لیے ایک عرصے سے کام کر رہے ہیں۔انہیں مختلف بین الاقوامی تنظیموں کے ساتھ کام کا تجربہ ہے۔انہوں نے پاکستان بھر میں 5000 سے زیادہ نوجوانوں کو تربیت دی ہے اور ایک رضاکارانہ تنظیم کی بنیاد رکھی ہے جو ایک فعال وصحت منداور پرامن زندگی کے حصول کے لیے نوجوانوں کوراغب کرتی ہے۔وہ ریڈیو کے ساتھ بھی منسلک ہیں اور ایک پروگرام کی میزبانی کرتے ہیں۔

- عبداللہ امتیاز

آزاد جموں وکشمیر، مظفرآباد سے تعلق رکھنے والے عبداللہ امتیاز پنجاب یونیورسٹی میں قانون کی تعلیم حاصل کررہے ہیں۔ وہ اپنے شعبہ میں اردو سوسائٹی کے صدر بھی ہیں۔ عبداللہ ریڈ کراس سوسائٹی، اسلامک ریلیف، اور ہیلپنگ ہینڈ کے ساتھ رضاکارانہ طور پر کام کرتے ہیں۔ وہ قومی یوتھ اسمبلی کی کابینہ کے رکن ہیں، جو پارلیمانی امور اور سیاسی بیداری کے اقدامات پر توجہ دیتی ہے۔

- سدرہ شاہد

راولپنڈی سے تعلق رکھنے والی سدرہ شاہد اس وقت انسٹی ٹیوٹ آف ریجنل اسٹڈیز، اسلام آباد میں سائبر سیکیورٹی پروگرام کے ساتھ ریسرچ انٹرن کے طور پر کام کر رہی

ہیں۔انہوں نے الخدمت فاؤنڈیشن اور ہلال احمر کے ساتھ کمیونٹی بہبود کے کاموں میں حصہ لیا ہے۔سدرہ کا تعلیمی پس منظر بین الاقوامی تعلقات اور دفاعی وسفارتی علوم ہیں۔

- جویریہ بی بی

جویریہ بی بی کا تعلق سرائے نورنگ، لکی مروت سے ہے۔انہوں نے اسلامیہ کالج پشاور سے شعبہ نفسیات میں گریجویشن کی ہے۔ وہ خیبر پختونخوا میں سماجی بہبود کے محکمہ کی رکن ہیں۔ 'گرواپ آرگنائزیشن' اور 'ہیومن رائٹس کونسل' کی بھی ممبر ہیں۔

- عمر خان

چارسدہ سے تعلق رکھنے والے ایڈووکیٹ عمر خان عثمانزئی پشاور، پاکستان کے وکیل ہیں۔ وہ سماجی مقاصد کے لیے کام کرتے ہیں۔ پسماندہ کمیونٹیز، خاص طور پر خواتین اور نوجوانوں کو بااختیار بنانے کے لیے مصروف عمل ہیں۔ وہ رضاکار تنظیم، "قومی سمیل تنظیم" کے سربراہ ہیں۔

- لکی بلوچ

لکی بلوچ کا تعلق تربت، بلوچستان، پاکستان سے ہے۔انہوں نے SBKWU، کوئٹہ سے زولوجی میں بی ایس کی ڈگری حاصل کی۔ ان کے پاس چھ سال کا تدریسی تجربہ ہے۔ کمپیوٹر نیٹ ورکنگ اور انگریزی زبان میں سند یافتہ ہیں۔

- امتیاز احمد

امتیاز احمد (بلوچ) ایک صحافی اور محقق ہیں جو ایران اور پاکستان میں سیکورٹی تنازعات سے جڑے امور میں مہارت رکھتے ہیں۔ وہ نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز

(NUML) اسلام آباد سے فارغ التحصیل ہیں اور فی الحال خراسان ڈائری میں کام کر رہے ہیں۔ امتیاز کا کام مختلف اہم موضوعات پر محیط ہے، جن میں سماجی مسائل، اقتصادی ترقی، سیاسی حرکیات، موسمیاتی تبدیلی کے اثرات، اور انسانی حقوق کے مسائل شامل ہیں۔

- سید کشف احمد

سید کشف احمد ایک سماجی کارکن ہیں۔ تعلیم، صحت اور ماحولیاتی پائیداری کے لیے کام کرتے ہیں۔ ملک کے اہم سماجی فلاحی اداروں کے ساتھ کام کرتے رہے ہیں۔

- ماہم احمد

ماہم کا تعلق پشاور سے ہے۔ انہوں نے پشاور یونیورسٹی سے بی بی اے فنانس کیا ہے۔ وہ یو ایس ایمبیسی ایلومنائی ممبر (PUAN) ہیں۔ وہ فیس بک اشتہارات اور ایمیزون پر تجارتی سرگرمیوں کی ماہر ہیں۔ ان کے پاس پشاور میں این جی اوز کے شعبے میں کام کا چار سال کا تجربہ ہے، اور وہ اپنی کمیونٹی میں موسمیاتی تبدیلی کی کارکن کے طور پر بھی کام کر رہی ہیں۔

تصاویر

Azadi FELLOWSHIP
(II)

Azadi FELLOWSHIP

Azadi FELLOWSHIP (II)
آزادی - انصاف - جمہوریت

آزادی - انصاف - جمہوریت

NATIONAL DEFENCE UNIVERSITY

Azadi
FELLOWSHIP

انٹرنیشنل ریسرچ کونسل برائے مذہبی اُمور ایک غیر سیاسی، غیر سرکاری تحقیقی ادارہ اور تھنک ٹینک ہے جو تنازعات اور حلِ تنازعات سمیت سماجی ہم آہنگی، امن کاری، جمہوریت، انسانی حقوق اور مذہبی سفارت کاری کے ذریعے پُر امن بین الاقوامی تعلقات کے فروغ کے لیے سرگرم عمل ہے۔

گزشتہ برس، انٹرنیشنل ریسرچ کونسل برائے مذہبی امور نے اسلام آباد میں سات روزہ آزادی فیلو شپ پروگرام کا پہلا کوہورٹ منعقد کیا۔ اس پروگرام میں مختلف مذاہب کے نوجوانوں نے شرکت کی، جو ملک میں سیاسی تقسیم کو کم کرنے، مذہبی ہم آہنگی کو فروغ دینے، اور آزادی، انصاف، جمہوریت کی تفہیم کرنے کے مقاصد کو پیش کرنے میں مدد فراہم کی۔

اس پروگرام نے مختلف موضوعات پر گفتگو کی، اور نوجوانوں نے اپنے نقطہ نظر پیش کیے، جس میں اقلیتوں کے حقوق، خواتین کے حقوق، انسانی حقوق، اور عدالتی اصلاحات شامل ہیں۔ اسلامی نظریاتی کونسل کے ساتھ بھی مکالمات ہوئے، جو ملک میں تعمیری کام کرنے کیلئے موثر ثابت ہوئے۔ آزادی فیلوشپ پروگرام کا سلسلہ مستقبل میں بھی جاری رہے گا۔

INTERNATIONAL RESEARCH COUNCIL FOR RELIGIOUS AFFAIRS (IRCRA)

+92 311 02 99 995, +92 51 22 25 650
Islamabad, Pakistan

ircra.org IRCRA ircra3 IRCRA3

ہماری مطبوعات

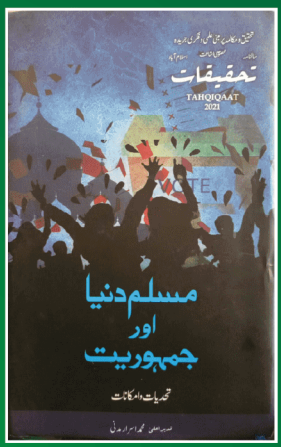

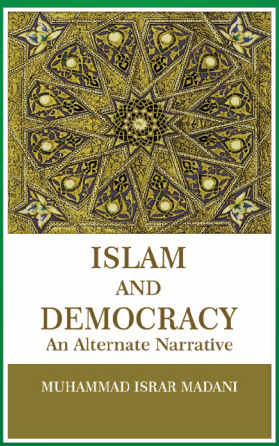

VISIT OUR WEBSITE

تحقیقات
TAHQIQAAT.PK